صفر المظفر، ربیع الأول
علم کا ذوق، عمل کا شوق بڑھانے والا بچوں کا رسالہ
اکتوبر 2021

ماہ نامہ

ذوق و شوق

کراچی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

Jamia-Uloom-Islamiyyah
(University of Islamic Sciences)
Allama Muhammad Yousuf Banuri Town
Karachi - Pakistan.

جامعۃ العلوم الاسلامیۃ
علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن
کراچی ۷۴۸۰۰ - پاکستان

Ref. No. _____ Date. _____

باسمہ تعالیٰ

از: حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب دامت برکاتہم
محترم اساتذہ کرام، ائمہ مساجد، ذمہ داران مدارس ومکاتب اور پرنسپل حضرات

طلبہ وطالبات کی تربیت کے لیے چند گزارشات

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بچوں کی اچھی تعلیم وتربیت ہمارا اسلامی وقومی فریضہ ہے۔ بچے ملک وقوم کے معمار اور معاشرے کا حسن ہوتے ہیں۔

اگر انھیں صحیح تعلیم وتربیت دی جائے تو اس سے ایک مضبوط اور مثالی معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ کیوں کہ انھی بچوں میں سے پڑھ لکھ کر کوئی ڈاکٹر بنتا ہے، کوئی انجینئر، کوئی عالم دین، کوئی افسر، کوئی تاجر، کوئی قانون دان، کوئی سیاست دان تو کوئی صحافی، الغرض زندگی کے مختلف شعبوں سے وابستہ ہوکر وہ ملک وقوم کی خدمت میں حصہ لیتے ہیں۔

بچوں کی تعلیمی وتربیتی ترقی کے لیے آپ ۴ کام پابندی سے فرمائیں تو ایک کام یاب معاشرے کے وجود میں آپ کا ضرور حصہ ہوگا:

۱۔ آپ بچوں کے لیے خوب دعائیں مانگیں، ان پر خوب محنت کریں، ان کے بول چال پر نظر رکھیں۔ سچائی، امانت داری، ایثار، والدین کی اطاعت، بڑوں کا ادب، پڑوسیوں کا خیال، چھوٹوں پر شفقت اور ہر کام کو محنت ولگن سے صحیح طریقے سے کرنے کا بار بار درس دیں۔ یہ صفات بچوں کی زندگی میں آجائیں اس کے لیے "تربیتی نصاب" کے نام سے ایک نصاب تیار کیا گیا ہے۔

۲۔ بچوں کی ذہنی صلاحیت کو مدنظر رکھتے ہوئے انبیائے کرام علیہم السلام، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، تابعین وتبع تابعین رحمہم اللہ اور بزرگانِ دین کے حالات اور واقعات کو مختلف مثالوں اور کہانیوں کے ذریعے ان کے سامنے بیان کریں۔ ساتھ ہی عملی پہلوؤں کی الگ سے نشان دہی بھی کریں۔ اس کے علاوہ "صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے واقعات" اور "تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ کے واقعات" نامی کتابوں سے بچوں کو پڑھ کر سنائیں اور ان کو مطالعہ کرنے کی ترغیب دیں۔

۳۔ بچوں کو اردو زبان میں اچھے مواد پر مشتمل دینی رسائل وجرائد کے پڑھنے اور ان میں لکھنے کا عادی بنائیں۔ جس سے انھیں زبان وبیان کے ساتھ عمدہ تحریر پر قدرت حاصل ہوگی۔ پھر جب وہ عملی میدان میں جائیں گے تو آنی والی نسلوں کے سامنے اپنی بات اچھے انداز میں پیش کرسکیں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

الحمد للہ! اسی سوچ کو سامنے رکھتے ہوئے "جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن"، "وفاق المدارس العربیہ پاکستان" کے فضلاء اور "اسکولوں کے اساتذہ کرام" کی زیرِ نگرانی بچوں کا ماہ نامہ "ذوق وشوق" شائع ہورہا ہے۔ ماشاء اللہ لاقوۃ الا باللہ جس میں بچوں کو اساتذہ کرام اور والدین کے ادب، اسکول ومدرسے کی پابندی، پان گٹکا اور بری صحبت سے بچنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ میں اسے اللہ تعالیٰ کا خاص فضل سمجھتے ہوئے شکر بھی ادا کرتا ہوں۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي بِنِعْمَتِهٖ تَتِمُّ الصَّالِحَاتُ

۴۔ اسکولوں میں بچوں کی تربیت کے لیے "پانچ منٹ کا مدرسہ" ایک کتاب تیار کی جارہی ہے۔ اگر اسمبلی میں روزانہ ۵ منٹ بچوں کو کتاب پڑھ کر سنا دی جائے تو بہت فائدہ ہوگا۔ ائمہ مساجد اور بنات کے مدارس کے مہتممین سے بھی یہی گزارش ہے کہ وہ اس کتاب کو طالبات اور مقتدیوں کو بعد فجر یا عصر مناسب ہو تو سنائیں۔

آپ حضرات سے گزارش ہے کہ خود بھی اس کا مطالعہ کریں اور اپنے گھر، خاندان، اسکول، مکاتب اور مدارس کے بچوں کو اس کے پڑھنے کی خوب ترغیب دیں۔ تاکہ ہماری نسل کتاب دوست بنے۔ مساجد سے ملحق چھوٹی سی لائبریری بنائیں، نوجوانوں کو مطالعے کا شوق دلوائیں۔

میں امید کرتا ہوں کہ آپ میری اس گزارش پر عمل کرکے معاشرے کی اصلاح میں اپنا کردار ضرور ادا کریں گے۔

اللہ تعالیٰ آپ حضرات کی قدم قدم پر مدد فرمائے اور آپ حضرات کو ہمیشہ سرسبز وشاداب رکھے۔ آمین

والسلام

عبدالرزاق اسکندر

۱۴۴۰/۱/۲

P.O. Box: 3465 Karachi Code No. 74800, Phone: (0092-21) - 34913570 - 34912683 - 34915966 - 34123366 - 34121152
Fax: (0092-21) - 34919531, Karachi Pakistan. URL: www.banuri.edu.pk , E-mail: info@banuri.edu.pk

پیغامِ الٰہی جل جلالہ

عبدالعزیز

(مفہومِ آیات: 94 تا 96 از سورہ بقرہ)

''اے محمد! آپ (ان یہودیوں سے) کہہ دیجیے کہ (تمھارے کہنے کے مطابق) اگر آخرت کا گھر اللہ کے نزدیک خالص تمھارے ہی لیے ہے تو تم (اپنی بات کو سچا ثابت کرنے کے لیے ذرا) موت کی تمنا کر کے دکھلا دو اگر تم (واقعی) سچے ہو، اور (ہم یہ بھی بتائے دیتے ہیں کہ) یہ لوگ اپنے ان (کفریہ) اعمال کی وجہ سے جو اُنھوں نے آگے بھیجے ہیں، کبھی بھی اس (موت) کی تمنا نہ کریں گے اور اللہ ان ظالموں کو خوب جانتا ہے اور (یہ یہودی موت کی تمنا تو کیا خاک کریں گے) آپ (تو) انھیں (عام) لوگوں سے بڑھ کر (دنیا کی) زندگی کا حریص پائیں گے اور (دوسروں کو تو چھوڑیے، انھیں آپ بعض) مشرکوں سے بھی بڑھ کر (دنیا کی زندگی کا حریص پائیں گے) اور (ان کی یہ حالت ہے کہ) ان کا ایک ایک (فرد) یہ آرزو رکھتا ہے کہ اس کی عمر ہزار برس ہو جائے اور (بالفرض اگر اِتنی عمر ہو بھی گئی تو کیا فائدہ، کیوں کہ) یہ چیز عذاب سے (تو) بچانے والی نہیں، (چاہے کسی کی) عمر زیادہ ہو جائے اور اللہ ان کے ان (بُرے) کاموں کو دیکھتا ہے جو وہ کرتے ہیں۔''

عزیز دوستو! یہودیوں کا ایک دعویٰ یہ بھی تھا کہ آخرت کی بھلائی، جنت میں داخلہ اور وہاں کی نعمتوں کا ملنا، یہ سب ہمارے لیے ہی خاص ہے۔ کسی اور کو یہ سب نہیں ملنے والا۔ ان کے اس جھوٹے دعوے کی وجہ سے انھیں یہ کہا گیا کہ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو تو پھر موت کی دعا کرو، تاکہ تمھیں یہ نعمتیں مل جائیں، لیکن وہ اس پر آمادہ نہیں ہوئے۔ اس لیے کہ ان لوگوں کو اپنے بُرے اعمال اور اُن پر ملنے والی سزا کا پتا تھا، اس لیے وہ موت کی تمنا اور دعا کر بھی نہیں سکتے تھے۔

آگے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ یہودی موت کی تمنا اور دعا تو کیا کرتے، یہ تو ہزار ہزار برس کی زندگی چاہتے ہیں، یہ لوگ تو آخرت پر ایمان نہ رکھنے والے مشرکوں سے بھی زیادہ دنیا کی زندگی کے حریص ہیں، لیکن اگر بالفرض انھیں اتنی لمبی عمریں دے بھی دی جائیں تب بھی آخرت کے عذاب سے تو چھٹکارا نہیں پائیں گے نا! کیوں کہ ہزار سال بعد بھی تو آخر موت آئے گی۔

پیغامِ نبوی ﷺ

راشد علی نواب شاہی

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''تم سچائی کو لازم پکڑو اور ہمیشہ سچ بولو، کیوں کہ سچ بولنا نیکی کے راستے پر ڈال دیتا ہے اور نیکی جنت تک پہنچا دیتی ہے۔''

(مسلم، ۶۶۳۹، عن عبداللہ رضی اللہ عنہ)

عزیز ساتھیو!

جو بات صحیح اور واقع کے مطابق ہو وہ سچ ہے اور جو واقع کے مطابق نہیں ہوتی، وہ جھوٹ کہلاتی ہے۔

ہم لوگ آپس میں باتیں وغیرہ کرتے ہیں۔ کچھ لوگ کاروبار کرتے ہیں، تجارت کرتے ہیں، ملازمت کرتے ہیں۔ بچے بچیاں اسکول اور مدرسے میں پڑھتے ہیں۔

عزیز ساتھیو! اس حدیث میں آپ ﷺ کی ہمیں راہ نمائی فرمائی ہے کہ ہم سچ کو زندگی بھر اپنا شعار بنالیں اور ہر معاملے میں اور ہر جگہ سچ بولیں۔ سچ کا ساتھ دیں اور جھوٹ سے بچیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم سچوں کے ساتھ ہو جائیں۔

پہلے زمانے میں تو کافر بھی جھوٹ بولنے کو اپنے لیے عیب سمجھتے تھے۔

آج کل ہمارے ہاں ایک غلط رواج اور غلط بات پھیلنا شروع ہو گئی ہے کہ اگر جھوٹ نہیں بولیں گے تو کاروبار نہیں ہو سکتا۔ جب تک جھوٹ نہ بولیں لوگ یقین کرنے پر تیار نہیں ہوتے۔ یہ انتہائی غلط باتیں ہیں۔

عزیز ساتھیو! ہمارے پیارے نبی ﷺ ہماری اسی بات کی طرف راہ نمائی فرماتے ہیں جو ہمارے حق میں دنیا اور آخرت میں بہتر ہو۔ انھیں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ تم سچائی کو لازم پکڑو اور ہمیشہ سچ بولو، کیوں کہ سچ بولنا نیکی کے راستے پر ڈال دیتا ہے اور نیکی جنت تک پہنچاتی ہے۔

دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سچ بولنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

علم کا ذوق، عمل کا شوق بڑھانے والا بچوں کا رسالہ

ماہ نامہ

ذوق و شوق

کراچی

زیر سرپرستی:

حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم

صفر المظفر، ربیع الاول ۱۴۴۳ ہجری | جلد: 16

شمارہ: 10

ناشر: محمد عارف رشید

مجلس ادارت

- مدیر: عبدالعزیز
- معاون: محمد طلحہ شاہین

سرورق السٹریٹر: سید ناصر

آرٹسٹ: قیصر شریف

کمپوزر: سعد علی

نگران ترسیل: منور عمر

اس رسالے کی تمام آمدنی تعلیم و تبلیغ اور اصلاح امت کے لیے وقف ہے۔

قیمت 70

سالانہ خریداری بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک 1000/=

بذریعہ عام ڈاک 750/=

ماہ نامہ ذوق و شوق میں اشتہار شائع کرنے کا مطلب تصدیق ہے نہ سفارش۔ یہ صرف عوام کو مطلع کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ مصنوعات کے بارے میں قارئین خود تحقیق فرمالیں۔

خط و کتابت کا پتہ:

ماہ نامہ ذوق و شوق پی۔او۔بکس، 17984 پوسٹ کوڈ 75300 گلشن اقبال، کراچی

Email: zouqshouq@hotmail.com

zouq shouq/ذوق شوق

اشتہارات اور سالانہ خریداری کے لیے رابطہ کریں

0324-2028753, 0320-1292426

دفتری اوقات: صبح 8:00 تا 1:00

دوپہر 2:30 تا 6:00

عنوان	مصنف	صفحہ
حمد	انعم توصیف	04
جنت کا زینہ (نعت)	اثر جون پوری	05
سیرت کہانی (۲۹)	عبدالعزیز	06
بلاعنوان (۱۷۰)	تماضر ساجد	08
بازار کا ہنگامہ	محمد فیصل علی	11
ورفعنا لک ذکرک	ام نسیبہ	13
پتا نہیں کیوں؟	مفتی محمد معاویہ اسماعیل	14
آزادی کا سورج (۳)	ڈاکٹر صفیہ سلطانہ صدیقی	16
حاتم طائی کی بیٹی	محمد نعمان حیدر	20
ڈالر، پاؤنڈ اور جاپانی ین	رانا محمد شاہد	22
ناک کا بال	ڈاکٹر الماس روحی	24
جھوٹوں کے جھوٹے (۲۱)	حافظ محمد دانش عارفین حیرت	25
معیار عدل	دانیال حسن	30
الائچی (مسالا جات)	سعد علی چھیپا	32
خوں ریز نصیحت (تاریخی جھانکیاں)	محمد حذیفہ رفیق	33
ہمارے استاد (نظم)	محمد حارث حقانی	35
سلام پہنچے	قرۃ العین ہاشمی	36
فاتح کون؟ ۳	نذیر انبالوی	38
سچوں کے امام	عبداللہ بن مسعود	42
اس کے بعد کیا ہوا؟	الطاف حسین	45
نئے لکھاری	قارئین	51

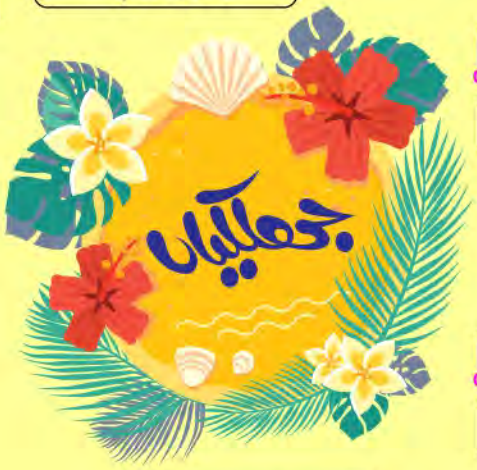

باہتمام محمد عارف رشید نے بچوں کی علمی و دینی ترقی و اصلاح کی خاطر ابن حسن پرنٹرس سے چھپوا کر شائع کیا۔

PARADISE BOOKS DISTRIBUTORS

Karachi: J-73, UNIT-1, GROUND FLOOR, OFF ALLAMA IQBAL ROAD, PECHS BLOCK-2, KARACHI. 021-34314981
LAHORE: SIDDIQUE MANAZIL, 2ND FLOOR, 40-ABBOT ROAD, STREET NEON PRINCE, LAHORE. 051-48430042
RAWALPINDI: OFFICE NO 2, FIRST FLOOR, STAR PLAZA, PARADISE HOUSE, RAWALPINDI. 042-3629701

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

امید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے۔

''کیا آپ کل اسکول تشریف لا سکتے ہیں؟ ہمیں آپ کی بچی کے متعلق ایک اہم بات کرنی ہے۔'' اسکول کے پرنسپل کا فون موصول ہوا۔

''جی جی، کیوں نہیں! ضرور، ویسے آپ مختصراً بتا سکتے ہیں کہ مسئلہ کیا ہے؟''

''بہت اہم مسئلہ ہے، آپ کے آنے پر ہی بات ہو سکے گی، شکریہ۔'' شکریہ کے الفاظ پر فون بند ہو گیا۔

''اللہ خیر کرے!'' بچی کے والد کے منہ سے نکلا۔

''مسئلہ یہ ہے جس نے ہمیں پریشان کر دیا کہ آپ کی بچی کسی کو شکریہ نہیں کہتی۔'' اگلے دن پرنسپل صاحب نے اپنے سامنے بیٹھے بچی کے والد سے کہا۔

''کیا مطلب!؟ میں سمجھا نہیں۔'' بچی کے والد نے نہ سمجھتے ہوئے سوال کیا۔

''میں ذرا تفصیل سے سمجھاتا ہوں، اصل میں آپ کی بچی ہمارے اسکول میں نئی ہے۔ ہمارے اسکول کے تمام بچے مختلف باتوں پر دوسرے بچوں کا شکریہ ادا کرنے کے عادی ہیں، جب کہ آپ کی بچی اس عادت سے عاری ہے اور یہ بات ہمارے لیے تشویش کا باعث ہے، بس اسی اہم مسئلے کے لیے ہم نے آپ کو اِسکول آنے کی زحمت دی ہے۔'' پرنسپل صاحب نے اپنی بات مکمل کی۔

''جی، میں سمجھ گیا، میں شرمندہ ہوں اور آپ سے معذرت خواہ بھی۔ میں اپنی بچی کو سمجھاؤں گا۔ امید ہے آپ کو آئندہ شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔'' بچی کے والد صاحب نے پرنسپل صاحب کو اِطمینان دلایا اور اِجازت لے کر گھر واپس آ گئے۔

محترم قارئین! آپ نے اوپر جو مکالمہ پڑھا، یہ مکالمہ اس وقت کا ہے جب ہمارے دوست کے ایک عزیز کا گھرانا پاکستان چھوڑ کر یورپ کے کسی ملک میں نیا نیا منتقل ہوا تھا، انھوں نے اپنی بچی کو وہیں کے ایک اسکول میں داخل کروا دیا تھا اور چند دِن بعد اُنھیں اس اسکول کے پرنسپل نے فون کر کے اسکول آنے کا کہا تھا۔

آپ ﷺ کے اخلاق حسنہ کے بارے میں حضرت مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک جگہ لکھا ہے: ''آپ ﷺ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اِظہار تشکر فرماتے تھے۔''

اب آپ سوچیے کہ ہمارے نبی ﷺ کی عادت مبارکہ کیا تھی اور ہمارا طرزِ عمل کیا ہے! جب کہ وہ لوگ جو مسلمان نہیں ہیں، انھوں نے یہ خوبیاں کس قدر مضبوطی سے اپنا لی ہیں۔

چلیے، ماہ ربیع الاول کے موقع پر ہم سب نیت کرتے ہیں کہ ہم حضور ﷺ کی ایک ایک عادت کو اپنائیں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ!

ارے سوچ کیا رہے ہیں؟ جلدی سے نیت کر لیجیے، نیت کرنے میں کون سے پیسے خرچ ہوتے ہیں!

انعم توصیف۔ کراچی

لفظوں کو اخلاص کے امرت سے میں دھوتی رہی
شان پھر اللہ کی ان سے بیاں ہوتی رہی

اس کی تخلیقات پر میں نے کیا جب فکر و غور
پھر زباں سُبْحَانَ رِبِّیَ ہی مری جپتی رہی

چھوڑ کر احباب تنہا سب مجھے جب جا چکے
یاد اس کو ہی کیا ، میں یَا وَلِیُّ پڑھتی رہی

تھک کے جب اپنے گناہوں سے کبھی کھولا قراں
آنسو بہتے ہی رہے ، لَاتَقْنَطُوْا تکتی رہی

چاہتا ہے مجھ کو ستر ماؤں سے بھی بڑھ کے وہ
جان کر یہ بات ، دل کو کیا خوشی ملتی رہی!

امتی محبوبِ ربانی کی ہوں ، سوچا یہ جب
خوش نصیبی پر میں اپنی رشک ہی کرتی رہی

حمد انعمؔ اس کی میں نے لکھنے کا سوچا اگر
سوچوں کی دنیا مری پھولوں سے ہی سجتی رہی

جنت کا زینہ

اثر جون پوری۔کراچی

جو چاہو کہ دل پر ہو نازل سکینہ
کرو مدحت تاجِ دارِ مدینہ
یہی کیف و مستی یہی جام و مینہ
مدینہ مدینہ مدینہ مدینہ
منور منور وہ زلفوں کی بدلی
معطر معطر نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا پسینہ
صدا غم اٹھاتے ، صدا مسکراتے
کشادہ جبیں تھی ، کشادہ تھا سینہ
کیا نوش جب آبِ زمزم ، دعا کی
مقدر میں ہو جامِ کوثر کا پینا
بس اب وصل کی کوئی صورت ہو مولیٰ
کہ ہجر نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے سکوں چین چھینا
ہے گر شوقِ جنت تو سنت پہ چلیے
اثرؔ راہِ سنت ہے جنت کا زینہ

سیرت کہانی ۲۹

عبدالعزیز

ہمارے پیارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی مبارک زندگی اور سیرت کے اہم واقعات پر مبنی ایک پیارا سلسلہ۔

مدینہ منورہ پہنچ کر جس جگہ آپ ﷺ کی اونٹنی سب سے پہلے بیٹھی تھی وہ جگہ دو یتیم بھائیوں حضرت سہل اور سہیل رضی اللہ عنہما کی تھی اور اُس جگہ کھجوریں خشک کی جاتی تھیں۔ عربی میں اسے مِربَد کہا جاتا ہے۔

آپ ﷺ نے دونوں بھائیوں کو بلوایا، تاکہ اس زمین کو مسجد کے لیے خرید لیں۔ خرید و فروخت کی گفتگو اُن دونوں کے چچا سے فرمائی، جن کی یہ دونوں پرورش میں تھے۔ ان دونوں بھائیوں نے آپ ﷺ سے عرض کیا:

''ہم یہ زمین بلا معاوضہ آپ کی نذر کرتے ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے اس کی قیمت نہیں چاہتے۔''

آپ ﷺ نے ان کی یہ پیش کش قبول نہیں فرمائی اور قیمت دے کر ہی زمین خریدی۔

آپ ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ قیمت ادا فرمائیں۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے دس دینار اُس زمین کے دیے۔

(فتح الباری، ج:7،ص:192)

اس زمین پر جو کھجوروں کے درخت تھے، انھیں کٹوانے اور جو مشرکوں کی قبریں تھیں، انھیں برابر کرنے کا آپ ﷺ نے حکم دیا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے کچی اینٹیں بنانے کا حکم دیا اور اَنصار و مہاجرین صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ خود بھی مسجد بنانے میں مصروف ہو گئے۔

آپ ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ خود بھی اینٹیں اٹھا اٹھا کر لاتے۔ آپ ﷺ کی زبانِ مبارک پر اُس وقت چند جملے تھے، جن کا ترجمہ ہے:

''یہ خیبر کی کھجوروں کا بوجھ نہیں، اے ہمارے رب! یہی بوجھ سب سے عمدہ اور بہتر ہے۔''

کبھی کچھ اور ارشاد فرماتے، جس کا ترجمہ ہے:

''اے اللہ! آخرت کی بھلائی کے علاوہ کوئی بھلائی نہیں، پس تُو انصار اور مہاجرین کی مدد فرما، جو آخرت کی بھلائی چاہتے ہیں۔''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زبانوں پر بھی چند جملے تھے، جن کا ترجمہ یہ ہے:

''اگر ہم بیٹھ جائیں اور نبی ﷺ کام کریں تو ہمارا یہ عمل، یعنی بیٹھ جانا بہت ہی بُرا کام ہوگا۔''

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ شعر پڑھتے جاتے تھے، جن کا ترجمہ یہ ہے:

''جو شخص اٹھتے بیٹھتے مسجد کی تعمیر میں لگا ہے اور وہ شخص جو کپڑوں کو مٹی سے بچاتا ہے، برابر نہیں ہیں۔''

(فتح الباری، ج:7،ص:193)

حضرت طلق بن علی رضی اللہ عنہ بتاتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ نے مجھے گارا گھولنے کا حکم دیا۔ میں پھاوڑا لے کر گھولنے کے لیے کھڑا ہو گیا۔''

دوسری روایت میں وہ بتاتے ہیں:

''میں نے عرض کیا:

'یارسول اللہ! میں بھی اینٹیں اٹھا کر لاؤں؟'

آپ ﷺ نے فرمایا:

'نہیں، تم گارا گھولو، تم اس کام سے خوب واقف ہو۔''

(زرقانی، ج:1،ص:368)

اس مسجد کی دیواریں کچی اینٹوں سے بنائی گئیں۔ اس کے ستون کھجور کے تنے تھے اور کھجور ہی کی شاخوں اور پتوں سے اس کی چھت بنائی گئی۔ جب بارش ہوتی تو پانی اندر آجاتا، لہٰذا بعد میں چھت کو گارے سے لیپ دیا گیا۔

یہ
مسجد تقریباً سو گز لمبی
اور سو گز ہی چوڑی تھی اور تقریباً
تین ہاتھ گہری بنیادیں کھودی گئی تھیں۔ قبلے کی دیوار بیت المقدس کی جانب رکھی گئی اور مسجد کے تین دروازے رکھے گئے۔ ایک دروازہ قبلے کی طرف، دوسرا دروازہ مغرب کی جانب اور تیسرا دروازہ وہ جس سے آپ ﷺ آتے جاتے تھے، جسے اب بابِ جبریل کہا جاتا ہے۔

جب سولہ یا سترہ ماہ بعد قبلہ بیت المقدس کے بجائے بیت اللہ ہو گیا تو پیچھے کا دروازہ بند کر دیا گیا، لیکن اس کے بجائے سامنے کی طرف دوسرا دروازہ بنایا گیا۔

آپ ﷺ نے مسجد کی تعمیر دو مرتبہ کی، پہلی مرتبہ ہجرت کے بعد اور دوسری مرتبہ فتح خیبر کے بعد۔ پہلی مرتبہ لمبان چوڑان سو گز سے کم تھی اور دوسری تعمیر میں سو گز سے زیادہ تھی۔

مسجد کے مکمل ہو جانے کے بعد ام المومنین حضرت سودہ بنت زمعہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے لیے دو حجرے (کمرے) بنائے گئے۔ باقی حجرے جیسے جیسے ضرورت محسوس ہوئی بنتے گئے۔ اکثر حجرے کھجور کی شاخوں کے اور کچھ کچی اینٹوں کے تھے۔ دروازوں پر کمبل اور ٹاٹ کے پردے ڈالے گئے تھے۔ ان حجروں میں روشنی کا انتظام نہیں تھا، چراغ نہیں جلتے تھے۔

حضرت حارثہ بن نعمان رضی اللہ عنہ کے مکانات مسجد نبوی کے برابر میں تھے تو یہ حجرے حضرت حارثہ بن نعمان رضی اللہ عنہ سے مکانات لے کر بنائے گئے تھے، یعنی جیسے جیسے حجرے بنانے کی ضرورت ہوتی حضرت حارثہ بن نعمان رضی اللہ عنہ اپنا مکان پیش کر دیتے۔

(صحیح بخاری، ج:1، ص:56)

حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''جب میں ذرا بڑا ہو گیا تو کھڑے ہو کر حجرے کی چھت کو ہاتھ لگا لیا کرتا تھا۔''

یہ حجرے مشرق کی جانب تھے۔ مغرب کی جانب کوئی حجرہ نہ تھا۔

(خلاصۃ الوفاء، ص:127)

اسی دوران میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت زید بن حارثہ اور حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہما کو مکہ مکرمہ روانہ کیا، تاکہ حضرت فاطمۃ الزہراء، حضرت ام کلثوم اور اُم المومنین حضرت سودہ رضی اللہ عنہن کو لے آئیں اور اُنھی کے ہم راہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا، تاکہ حضرت عائشہ، حضرت اسماء اور اُم رومان اور عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہم کو لے آئیں۔

جب زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ ان سب کو لے کر مدینہ منورہ پہنچے تو آپ ﷺ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے مکان سے تعمیر کردہ حجروں میں منتقل ہو گئے۔

(زرقانی، ج:1، ص:370)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''جب آپ ﷺ ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے تو ہم میں سے جب کوئی شخص مرنے کے قریب ہوتا تو ہم آپ کو اطلاع کر دیتے۔ آپ تشریف لاتے، اس کے لیے استغفار فرماتے۔ مر جانے کے بعد دفن تک وہیں تشریف رکھتے۔

اس میں بعض مرتبہ آپ ﷺ کو بہت دیر ہو جاتی، اس لیے ہم نے بعد میں یہ طے کر لیا کہ مرنے کے بعد آپ کو اطلاع دیا کریں، چناں چہ چند روز یہی معمول رہا کہ مرنے کے بعد آپ ﷺ کو اطلاع دیتے۔

آپ ﷺ تشریف لاتے، نماز پڑھتے اور میت کے لیے دعا اور اِستغفار فرماتے۔ بعض اوقات دفن میں بھی شرکت فرماتے اور بعض اوقات نمازِ جنازہ سے فارغ ہو کر واپس تشریف لے جاتے، پھر آپ ﷺ کی سہولت کی غرض سے ہم نے یہ کیا کہ جنازہ لے کر خود آپ ﷺ کے گھر پر حاضر ہو جاتے۔

آپ ﷺ وہیں اپنے گھر کے قریب جنازے کی نماز پڑھا دیتے، اس وجہ سے اس جگہ کا نام جہاں آپ ﷺ جنازے کی نماز پڑھا کرتے تھے، ''موضع الجنائز'' ہو گیا۔''

(طبقات ابن سعد، ج:1، ص:14)

.....(جاری ہے).....

حمزہ کے ہاتھ سے کیلکولیٹر چھوٹ کر پانی میں گر گیا تھا، لیکن وہ اس سے بے نیاز سمیر کو گھور رہا تھا۔

''ارے، کیلکولیٹر خراب ہو جائے گا!'' سمیر کی آواز سُن کر وہ چونکا اور جلدی سے کیلکولیٹر کو پانی سے نکال کر چلا کر دیکھنے لگا۔

''ٹھیک ہے، ابھی پانی اندر نہیں گیا تھا۔'' وہ اچھی طرح اطمینان کر لینے کے بعد بولا۔

''عجیب آدمی ہو تم بھی! خراب ہو جاتا تو پوچھتا! اور یہ ڈبے میں پانی کیوں رکھا ہوا ہے؟''

''وہ جوتے کیچڑ سے خراب ہو گئے تھے، انھیں صاف کرنے کے لیے لایا تھا۔ تم کچھ کہہ رہے تھے؟''

''میری چیزیں آج پھر غائب ہیں۔''

''آج پھر!؟'' حمزہ آہستہ سے بڑبڑایا، پھر پوچھنے لگا:

''آج کیا غائب ہے؟''

''ٹافیوں کا پورا پیکٹ!''

''ٹافیاں!؟''

''وہ ماموں نے دبئی سے بھجوائی تھیں۔ میری شامت آئی تھی کہ یہاں لے آیا۔ تمھیں پتا تو ہے کہ میں کتنی احتیاط کرتا ہوں انھیں استعمال کرنے میں۔'' پھر وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا:

''یار! میری گھڑی بھی نہیں ملی۔ بابا نے تحفے میں دی تھی۔ میں نے ابھی تک انھیں نہیں بتایا، ورنہ میری پٹائی پکی ہے۔''

''ایسا کرو، یہ جو ساتھ والے دو ہمسائے ہیں، ان کی تلاشی لو، انھی کا آنا جانا ہے ہمارے کمرے میں۔''

''اب یہی کرنا پڑے گا۔''

سمیر اور حمزہ ''روم میٹ'' تھے۔ ان کے کالج کا شمار شہر کے ممتاز تعلیمی اداروں میں ہوتا تھا۔ یہاں دور دراز کے طلبہ کی سہولت کے لیے رہائش کا انتظام بھی تھا۔ ابھی ہاسٹل کھلے ایک مہینا ہی ہوا تھا۔ پہلا ہفتہ گھر کو یاد کرنے اور کالج میں سیٹ ہونے میں گزر گیا تھا۔

ہاسٹل کی عمارت کھلی اور ہوادار تھی۔ درمیانے سائز کے کمروں میں تین تین طالب علم رہتے تھے۔ سمیر کے کمرے میں فی الحال وہ اور حمزہ ہی تھے۔

سمیر کا تعلق کھاتے پیتے گھرانے سے تھا۔ اس کی عادت تھی کہ ہر نئی چیز اپنے دوستوں کو ضرور دکھاتا۔ اس کی چیزیں مہنگی اور قیمتی ہوتی تھیں، لڑکے انھیں حسرت سے دیکھتے تو سمیر کو بہت خوشی ہوتی۔ وہ آئے روز اپنی چیزوں کی نمائش کرتا نظر آتا۔ انھیں چیزوں میں ایک سمیر کی گھڑی بھی تھی۔

اس کی گھڑی سب کی توجہ کا مرکز بن گئی تھی۔ خوب صورت سنہرے ڈائل والی گھڑی، جو اندھیرے میں چمکتی تھی۔ وہ لوگ بتیاں وغیرہ بند کر کے اندھیرے میں گھڑی کا عکس دیوار پر ڈالتے تو ڈائل کی روشنی میں مختلف شکلیں نظر آتیں۔

سمیر ہاسٹل بھر میں اپنی گھڑی کے توسط سے مشہور ہو گیا تھا۔ دوسرے ہفتے کا آخری دن تھا جب سمیر کی گھڑی گم ہونے کا شور مچا۔ ہوا کچھ یوں کہ حمزہ نے سمیر کو دیکھا کہ وہ الماری کو اُلٹ پلٹ رہا ہے۔ کافی دیر بعد تھک ہار کر اُس نے بتایا کہ گھڑی غائب ہے۔ سمیر کو اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے گھڑی الماری میں ہی رکھی تھی۔ بہر حال، بات وارڈن صاحب تک پہنچی۔ کمروں کی تلاشی لی گئی، مگر بے سود۔ آخر سمیر نے ہار مان لی۔

دو دن بعد ہی قیصر کا قلم چوری ہو گیا۔ اس کے بعد اورنگ زیب کا چائے کا کپ غائب تھا، پھر یہ معمول بن گیا۔ گھڑی کے بعد کوئی قیمتی چیز گم نہیں ہوئی، سب چھوٹی موٹی اور کم قیمت چیزیں ہی غائب ہوئی تھیں، اس لیے لڑکوں نے بھی اس بات کو سنجیدگی سے نہ لیا، لیکن آج سمیر کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ کل ہی بابا نے فون پر اُسے ڈانٹ پلائی تھی کہ وہ گھڑی ہاسٹل میں کیوں لے کر گیا ہے۔ ابھی تو اُنھیں اس کے غائب ہونے کا قصہ نہیں معلوم تھا، ورنہ نجانے اس کا کیا حشر ہوتا! اس نے تہیا کر لیا کہ وہ چور کو تلاش کر کے ہی رہے گا۔

اسے یقین تھا کہ چور تین کمروں میں سے ایک کا ہی ہو سکتا ہے، کیوں کہ انھیں

بہترین عنوان تجویز کرنے پر 250، دوسرا بہترین عنوان تجویز کرنے پر 150، تیسرا بہترین عنوان تجویز کرنے پر 100 روپے انعام دیا جائے گا۔ ''بلاعنوان'' کے کوپن پر عنوان تحریر کر کے ارسال کریں۔

عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 31 اکتوبر 2021 ہے۔

نوٹ: کمیٹی کا فیصلہ حتمی ہوگا جس پر اعتراض قابل قبول نہ ہوگا۔

لوگوں کی ایک دوسرے کے کمروں میں آمد و رفت تھی۔ وہ حمزہ کے ساتھ تلاشی لینے نکل کھڑا ہوا۔ دوسرے کمروں والے تلاشی دینے پر رضامند نہ ہوتے، لیکن ان چوریوں نے انھیں بھی پریشان کر رکھا تھا۔

اس جانب صرف تین کمرے تھے۔ ان کا کمرا درمیان والا تھا۔ دائیں طرف مستقیم اور اُس کے ساتھیوں کا کمرا تھا۔ انھوں نے اسے خوش آمدید کہا اور الماریوں کی چابیاں بھی اس کے حوالے کر دیں۔ ویسے اس کی ضرورت نہ تھی۔ مستقیم، حیدر اور ناصر، یہ تین اس کمرے میں رہائش پذیر تھے۔

کمرے کا دروازہ اٹھارہ گھنٹے کھلا رہتا تھا۔ الماریاں بند کرنے کا تکلف بھی نہیں کیا جاتا تھا۔ جو چاہے کمرے میں آئے۔ وہاں کی تلاشی لے کر وہ بائیں طرف گیا۔ اس کمرے میں شہیر اور عدنان رہتے تھے۔ تیسرا لڑکا یاسر بیمار تھا اور اپنے گھر گیا ہوا تھا۔

سمیر کمرے میں داخل ہوا تو شہیر باہر گیا ہوا تھا۔ عدنان نے خوش دلی سے اس کا استقبال کیا۔ یہ کمرا اکثر بند رہتا تھا۔ سمیر اِس سے پہلے صرف ایک مرتبہ تلاشی لینے کے لیے ہی یہاں آیا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ عدنان اور شہیر، دوسرے کمروں میں ہی پائے جاتے تھے۔

عدنان کی تلاشی کے بعد شہیر کی باری آئی۔ عدنان نے شہیر کی الماری کی چابی سمیر کو پکڑا دی۔ اس نے الماری کھولی ہی تھی کہ چونک اٹھا۔ اس کی نگاہ اچانک ایک طرف رکھی میز پر موجود رسالے پر پڑی تھی اور اسے کھسیانا پڑا تھا۔ رسالہ دیکھتے ہی اسے یاد آ گیا کہ وہ رات کو ایک دل چسپ ناول پڑھ رہا تھا۔ حمزہ نے بتی بند کی تو وہ مجبوراً کمرے سے باہر کھسک آیا تھا، آتے ہوئے وہ ٹافیوں کا پیکٹ بھی ساتھ لیتا آیا تھا، پھر ناول میں مگن رہنے کے ساتھ ساتھ وہ ٹافیاں بھی چوستا رہا۔ ٹافیاں ختم ہوئیں تو ناول بھی مکمل ہو چکا تھا۔ خالی پیکٹ وہ وہیں گھاس پر ڈال کر اندر آ گیا تھا۔

عدنان دوسری طرف متوجہ تھا، اس لیے اس کی بدلتی کیفیت کا اندازہ نہ لگا سکا۔ سمیر کو بھی عافیت اسی میں نظر آئی کہ الماری کی ہلکی پھلکی تلاشی لے لے۔ اس نے الماری کھول کر سرسری سا جائزہ لینا شروع ہی کیا تھا کہ اتفاقاً ہی اس کی نظر ایک کونے پر پڑی۔ وہ دوسری مرتبہ چونک اٹھا۔ اسی وقت شہیر کمرے میں داخل ہوا۔

''یہاں کیا ہو رہا ہے لڑکو!؟''

اس نے بڑے ''اسٹائل'' سے کہا۔ سمیر خاموش رہا۔ شہیر کی نظر سمیر کی نظروں کے تعاقب میں اٹھی اور یک دم اس کا رنگ فق ہو گیا۔ یہ تبدیلی عدنان اور سمیر کے ساتھ ساتھ دروازے پر کھڑے حمزہ نے بھی نوٹ کی۔

''سمیر کی پھر کوئی چیز گم ہو گئی ہے، اس لیے یہ یہاں تلاشی لینے آیا ہے۔ میں نے اسے تمھاری الماری کی چابی بھی دے دی ہے۔'' عدنان نے پریشان ہو کر وضاحت کی۔

''میں تلاشی لے چکا ہوں۔'' سمیر، شہیر کو گھورتے ہوئے بولا۔ شہیر کے ہونٹ کپکپانے لگے، لیکن اس سے کچھ بولا نہ گیا۔

''یار! دعا کرو، میری گھڑی مل جائے، باقی خیر ہے!''

سمیر نے الماری کے پٹ بند کیے اور تالا لگا کر چابی عدنان کو واپس دیتا کمرے سے نکل آیا۔

باہر نکلتے ہی حمزہ نے اسے پکڑ لیا۔

''شہیر کو کیا ہوا تھا؟''

''مجھے کیا معلوم!؟''

''اس کا رنگ ہی اڑ گیا تھا۔''

''ہوسکتا ہے اس نے کچھ ایسا رکھا ہوا ہو جو وہ کسی کو نہ دکھانا چاہتا ہو۔''

''تم نے ایسا کچھ دیکھا تھا؟''

''اوں...... ہوں۔'' اس نے جھنجھلا کر نفی میں سر ہلایا اور تیزی سے اپنے کمرے میں داخل ہوگیا۔

اگلے دن وہ میدان میں اکیلا بیٹھا تھا جب شہیر اُس کے پاس آیا۔

''مم...... مجھے معاف کردو سمیر! کل تم نے میری عزت رکھ لی، ورنہ......''

سمیر اُسے دیکھتا رہا۔

''بس یہ گندی عادت مجھے کچھ ہی عرصہ پہلے لگی ہے۔ کوئی بھی چیز پسند آجائے تو اُسے پار کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہاں آیا تو ارادہ تھا کہ اب میں ایسا نہیں کروں گا، لیکن تمھاری گھڑی مجھے پسند آگئی، پھر گھڑی کے بعد ایک دو دفعہ کچھ پیسوں کی ضرورت پڑی تو مزید چوریاں کرنی پڑیں۔ تمھاری گھڑی کافی قیمتی تھی، اس لیے اسے بیچنے کی ہمت نہیں ہوسکی۔ الماری میں اس طرح چھپائی تھی کہ پہلی مرتبہ تلاشی لینے پر تم بھی نہ دیکھ سکے، لیکن کل تمھیں وہ خانہ بھی مل گیا۔

کل تم نے میری الماری میں چھپائی گھڑی دیکھ لی تھی، لیکن مجھے بے عزت ہونے سے بچالیا۔ میں تمھارا شکرگزار ہوں۔ اب آئندہ ایسا کام پھر کبھی نہیں کروں گا، ان شاءاللہ! اور کوشش کروں گا کہ جن کی چیزیں لی ہیں انھیں کسی طرح ان کی قیمت ادا کردوں۔ تمھارا یہ احسان مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔''

شہیر نے اٹھتے ہوئے چپکے سے کوئی چیز سمیر کی گود میں ڈال دی۔

اس کے جانے کے بعد سمیر نے اپنی گھڑی کا جائزہ لیتے ہوئے اطمینان سے سَر ہلایا۔ شہیر کے ساتھ ساتھ وہ بھی اپنی ایک بُری عادت ترک کرنے کا عزم کرچکا تھا۔

اس دن کے بعد نہ تو ہاسٹل میں کوئی چوری ہوئی نہ ہی کسی نے سمیر کو اپنی کسی قیمتی چیز کا رُعب جماتے دیکھا!

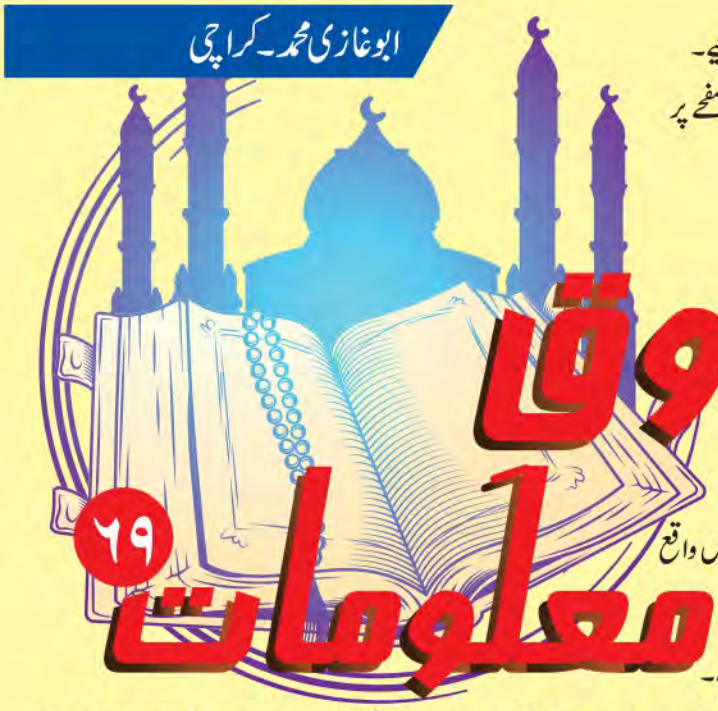

ابوغازی محمد۔ کراچی

یہ کُل پانچ اشارات ہیں۔ آپ ان کی مدد سے درست جواب تک پہنچنے کی کوشش کیجیے۔ اگر آپ ان اشارات کے ذریعے جواب تک پہنچ جائیں تو بُوجھا گیا جواب آخری صفحے پر موجود کوپن کے ساتھ ہمیں ارسال کردیجیے اور اپنی معلومات کا انعام ہم سے پائیے۔

آپ کا جواب ۳۱، اکتوبر تک ہمیں پہنچ جانا چاہیے۔

یہ کون ہیں؟

١ آپ کا اصل نام ولی الدین عبدالرحمٰن تھا۔ آپ 1332ء میں برِّ اعظم افریقہ میں واقع اسلامی ملک ''تیونس'' میں پیدا ہوئے۔

٢ آپ ممتاز عالم، مؤرخ اور فلسفی تھے۔ آپ کو ''بابائے عمرانیات'' تسلیم کیا جاتا ہے۔

٣ آپ کی مشہور تصنیف کا نام ''مُقدَّ مہ'' ہے۔ آپ کی تصانیف کا کئی یورپی زبانوں میں ترجمہ ہوچکا ہے۔ 1389ء میں آپ نے حج کا فریضہ انجام دینے کے بعد قاہرہ (مصر) واپس آکر اپنی ایک عظیم الشان تصنیف مکمل کی۔

٤ 1386ء میں سلطانِ مصر نے آپ کو ''مالکیہ'' کا قاضی مقرر کیا۔

٥ آپ نے 1406ء میں وفات پائی۔ آپ کو قاہرہ میں سپردِ خاک کیا گیا۔

بازار کا ہنگامہ

محمد فیصل علی۔ سناواں

سورج پوری آب وتاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ بازار میں چاروں طرف چہل پہل تھی۔ مور اور مورنی اپنے لاڈلے بیٹے عانی کے ہم راہ بازار کا دورہ کررہے تھے۔ انھوں نے بازار سے کچھ ضروری اشیا خریدنی تھیں۔ مورنی صاحبہ بڑے ناز واَنداز سے خراماں خراماں چل رہی تھیں۔ ان کی نگاہیں گردوپیش کے اسٹالز پر جمی تھیں، جہاں رنگ برنگی چیزیں سجی نظر آرہی تھیں۔ کپڑے، جوتے، زیورات، کھانے پینے کی چیزیں اور قیمتی کتابوں کے اسٹالز اپنی اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ دکان دار گاہکوں کے ساتھ بھاؤ تاؤ کرنے میں مگن تھے۔

اچانک مورنی صاحبہ رکیں اور اُن کی نظریں ایک اسٹال پر جم گئیں، جہاں ایک نحیف سی بکری بیش قیمت ٹوپیوں کا اسٹال سجائے کھڑی تھی۔ مورنی صاحبہ کے تیور لمحہ بہ لمحہ بدل رہے تھے اور اُن کا پارہ رفتہ رفتہ ''ہائی'' ہوتا نظر آرہا تھا۔

مور صاحب اس ساری صورتِ حال کا بغور جائزہ لے رہے تھے اور اُن کی چھٹی حِس خطرے کا الارم بجا رہی تھی، لہٰذا اُنھوں نے پورے خشوع خضوع سے ''جل تُو جلال تُو، آئی بلا کو ٹال تُو'' کا وِرد شروع کر دیا تھا اور اُن کے دل کی دھڑکنیں اور وِرد کی رفتار تیز ہوتی جارہی تھی، لیکن ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔

اگلے ہی لمحے بازار مورنی صاحبہ کی مترنم چیخ سے گونج اٹھا:

''چور، چور! پکڑو، پکڑو!''

یہ چیخ سن کر بازار میں یک لخت سناٹا سا چھا گیا اور اِردگرد کے جانور مڑ مڑ کر اُس طرف دیکھنے لگے کہ کیا ماجرا ہے؟

''بیگم صاحبہ! کون ہے چور اور کہاں بھاگ رہا ہے؟''

مور صاحب نے کسی ماہر جاسوس کی طرح دائیں بائیں دیکھ کر پوچھا۔

''یہ ہے چور، پکڑ لو اِسے۔''

مورنی صاحبہ نے اپنی تیر نما انگلی سے بکری کی طرف اشارہ کیا۔

''کیا!؟ نہیں!''

بکری بُری طرح چلائی۔

اب ان کے گرد کافی جانور جمع ہو چکے تھے۔ بکری انھیں غصیلی نگاہوں سے گھور رہی تھی۔

''امی! اس بے چاری بکری نے کیا چرا لیا؟ یہ تو اپنی جگہ سے ہلی بھی نہیں۔'' مورنی کا بیٹا عانی بولا۔

''میں ابھی ثابت کرتی ہوں، لیکن پہلے اس چور بکری کو تو پکڑ لو۔''

مورنی صاحبہ نے اصرار کیا۔

''بیگم صاحبہ! آپ بتائیں، میں اسے پکڑ لیتا ہوں۔ یہ لیں، پکڑ لیا۔''

مور نے آگے بڑھ کر بکری کا ایک بازو پکڑ لیا، لیکن حقیقت یہ تھی کہ اسے یہ معاملہ بالکل بھی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

''امی! اب بتائیں بھی سہی، آخر اِس نے کیا چرایا ہے؟'' عانی نے بُرا سا منہ بنایا۔

''بالکل! بالکل بتائیں، ہم آپ کے ساتھ ہیں۔''

دیگر جانوروں نے بھی اس کی تائید کی۔

مورنی نے دائیں بائیں دیکھا اور پھر ڈرامائی انداز میں بولی:

''یہ دو ٹوپیاں چوری کی گئی ہیں۔''

''نہیں!'' بکری دوبارہ چلائی۔

ادھر ٹوپیوں پر نظر پڑتے ہی عانی چونک پڑا۔ یہ ٹوپیاں رنگین دھاگوں اور خوب صورت پروں سے بنی ہوئی تھیں اور بہت ہی بھلی لگ رہی تھیں۔ اسی وقت عانی کے لب ہلے:

''امی سچ کہہ رہی ہیں، یہ ٹوپیاں چرائی گئی ہیں۔''

''یہ جھوٹ ہے! یہ ہماری اپنی ٹوپیاں ہیں۔'' بکری نے چیخ کر کہا۔

''میں ثبوت پیش کروں گی۔''

مورنی نے بکری کو شعلہ بار نگاہوں سے گھور کر کہا، پھر وہ بولی:

''یہ ٹوپیاں میرے بیٹے عانی کی ہیں۔ عانی انھیں اپنی نانی کے گھر سے لایا تھا۔ ایسی ٹوپیاں ہمارے شہر میں بنتی ہی نہیں تو تمھارے پاس کہاں سے آ گئیں؟''

''اوہ! اوہ!'' مورنی کی بات سن کر سبھی چونک اٹھے۔

''عانی! لگتا ہے تم کچھ کہنا چاہتے ہو؟ بولو۔''

مور نے بیٹے سے کہا۔

''یہ ٹوپیاں واقعی میری ہیں، لیکن.....''

وہ کہتے کہتے رک گیا۔

''لیکن کیا بیٹے!؟'' مورنی چونکی۔

''لیکن بکری نے یہ ٹوپیاں میرے گھر سے نہیں چرائیں۔''

عانی نے کہا تو سبھی اچھل پڑے۔

''کیا مطلب عانی!؟''

مورنی صاحبہ نے اسے گھورا۔

''جی ہاں امی! دراصل میں نے یہ ٹوپیاں اپنے کلاس فیلو اَسمر کو تحفے میں دے دی تھیں، لگتا ہے کہ بکری نے اُسی سے چرائی ہیں۔''

عانی نے کہا۔

''کیا کہا!؟ اسمر کو تحفے میں؟''

بکری حیرت سے اچھلی۔

''جی ہاں۔''

عانی نے جواب دیا۔

''اوہ، اب میں سمجھی، اسمر میرا بھانجا ہے۔ اس کی ماں، یعنی میری بہن کئی دنوں سے بیمار ہے۔ ہمارے پاس پیسے نہیں تھے، اس لیے ہم اپنی قیمتی چیزیں بیچ بیچ کر اُس کا علاج معالجہ کر رہے ہیں۔ آج اسمر نے مجھے یہ دو ٹوپیاں بھی دے دیں کہ خالہ انھیں بیچ کر پیسے لے آئیں، تاکہ ہم امی کے لیے دوا لے سکیں۔ یہ ہے کل کہانی۔''

بکری نے اداس لہجے میں مکمل تفصیل بتائی۔ یہ سُن کر سبھی جانوروں کے چہروں پر بھی اداسی پھیل گئی۔

''اوہ! اسمر کی امی بیمار ہیں اور اُس نے مجھے بتایا بھی نہیں، میں ابھی اس کے پاس جا رہا ہوں۔ کیا میں جاؤں ابو!؟''

عانی نے ابو سے اجازت طلب کی۔

''ضرور بیٹے! بیمار کی عیادت کے لیے جانا بہت ثواب کا کام ہے۔ تم چلو، ہم بھی آتے ہیں ابھی۔''

مور صاحب نے بیٹے کی حوصلہ افزائی کی۔

''معذرت بہن! میں تمھیں غلط سمجھی، مجھے معاف کر دو اور مجھے یہ پانچ ٹوپیوں کا سیٹ بھی دو، میں یہ خریدوں گی۔''

مورنی نے فوراً بکری سے معافی مانگ لی۔ بکری بھی بڑے دل کی مالک تھی۔ اس نے مورنی کو تہ دل سے معاف کر دیا اور کہا:

''کوئی بات نہیں بہن! شکر ہے کہ غلط فہمی دور ہو گئی۔ یہ رہیں آپ کی ٹوپیاں۔''

مورنی کے بعد دیگر جانور بھی اس سے چیزیں خریدنے لگے، تاکہ وہ سامان بیچ کر جلدی گھر جائے اور اپنی بہن کا علاج کرا سکے۔

یوں بازار کا یہ ہنگامہ احساسِ ہم دردی کی نیک سوچ کے ساتھ اختتام کو پہنچ گیا۔

ام نسیبہ۔ کراچی

وہ جنھوں نے انسانیت کے مردہ تن میں نئی روح پھونکی، وہ جن کے انفاسِ طیب سے گلشن حیات مہک اُٹھا، وہ جن کے انداز میں عرش جیسی رفعتیں ہیں، وہ جن کی مدحت ملائکہ کا وِرد ٹھہری، جن کے چہرے کا ذکر آئے تو قرآن وَالضُّحٰی پکارے، جن کی زلفوں کی بات آئے تو قرآن وَالَّیْلِ کہے، جن کے اخلاقِ حسنہ کو قرآن کامل کہہ دے، جن سے محبت کو اللہ اپنی محبت کے ساتھ مشروط کردے اور جن کی ذاتِ مبارکہ کو قیامت تک کے لیے عملی نمونہ بنایا جائے تو کائنات اس اعلانِ حق سے گونج اُٹھے: ''وَ رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝''

انبیائے کرام علیہم السلام کے طبقے میں پہلے آنے والوں نے ان کا نام نامی، اسمِ گرامی ازل سے مسطور پایا، وہ آخر میں آکر پہلے آنے والوں کے امام ٹھہرے۔ پہلوں میں سے جو آیا ایک وقت کے لیے، ایک خطے کے لیے آیا۔ وہ آخر میں آئے اور ہر وقت کے لیے، ہر خطے کے لیے اور تمام انسانیت کے لیے آئے۔ پہلے آنے والے جانے کے لیے آئے، وہ آئے تو صفحۂ حیات پر نقش ہوگئے۔ پہلے والوں میں سے ہر ایک کے جانے کے بعد دوسرے ہم منصب جگہ لینے کے لیے تشریف لے آتے، لیکن وہ آئے تو اُن کے جانے کے بعد وہ سانچا ہی نہ رہا جس میں آدم علیہ السلام کے فرزند، نورِ ہدایت کے پیکر کی صورت ڈھل ڈھل کر نکلتے رہے۔ جسم مستور ہوگیا، مگر اُن کا فیض تا قیامت جاری رہے گا۔

انھیں خاتم النبیین کہیے تو بجا، سید المرسلین کہیے تو بجا، امام الانبیاء کہیے تو بجا، سید الاولین والآخرین کہیے تو بجا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)۔ وہ آفتاب ہیں، باقی ان کی کرنیں ہیں۔ وہ مرکز ہیں، باقی سیارے ہیں۔ وہ بدرِ کامل ہیں، باقی جگ مگ تارے ہیں۔ اس رفعت مقام ہی کا بیان ہے: ''وَ رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝''

عزیز قارئین! ہمارا ایمانِ کامل ہے کہ ساتوں زمینیں اور ساتوں آسمان، انسان اور حیوان، نباتات و جمادات، حتیٰ کہ پوری کائنات، معززین و اُمرا اور بادشاہوں کو جمع کیا جائے تو ہمارے آقا، سرورِ کونین، ساقی کوثر، شافع محشر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عزت اور شان ان سب سے برتر اور اَرفع ہے۔ ؎

تاریخ اگر ڈھونڈے گی ثانی محمد
ثانی تو بڑی چیز ہے ، سایہ نہ ملے گا

اللہ تعالیٰ اپنی صفات میں کامل ہے اور زمین و آسمان کے خزانوں کا مالک ہے۔ اس رحیم و کریم ذات نے انسان کو بے حد و حساب نعمتوں سے نوازا ہے۔ عجیب بات تو یہ کہ اتنی بے شمار نعمتیں دے کر بھی اللہ تعالیٰ نے اپنا احسان نہیں جتلایا، تاہم ایک نعمت اس نے ایسی دی کہ جسے دے کر مُنعمِ حقیقی کو بھی انعام دینے کا مزہ آگیا اور اللہ پاک نے کھلے الفاظ میں یوں فرمایا:

''لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا۔''

(تحقیق، اللہ نے ایمان والوں پر احسان فرمایا کہ ان میں (اپنے) رسول کو بھیجا۔)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

''وَ رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝'' (اے محمد! ہم نے آپ کا ذکر بلند کردیا۔)

بلند کردیں گے نہیں فرمایا، بل کہ بلند کردیا فرمایا۔ وعدہ نہیں ہے کہ آئندہ کریں گے، اس کا انتظار کیجیے۔ نہیں، انتظار کی تکلیف ہم آپ کو نہیں دیتے۔

وَ رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝ فرما کر ازل سے ابد تک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذکر کو بلند کردیا۔ سیرتِ طیبہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک ایک پہلو کو اُجاگر کرکے قیامت تک کے لیے محفوظ کرلیا گیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سچا عاشق آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام پر قربان ہونے کو بے قرار رہتا ہے اور میرے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان دیکھیں کہ ان کا عشق ان کے عشاق کو ایک دوسرے کا رقیب نہیں، بل کہ حبیب بنا دیتا ہے۔

بزمِ کونین پہلے سجائی گئی
پھر تیری ذات منظر پہ لائی گئی
کیا عرب کیا عجم ، سب ہیں زیرِ نگیں
تجھ سا کوئی نہیں ، تجھ سا کوئی نہیں
مصطفی ، مجتبیٰ! تیری مدح و ثنا
میرے بس میں نہیں ، دسترس میں نہیں
دل کو ہمت نہیں ، لب کو یارا نہیں
تجھ سا کوئی نہیں ، تجھ سا کوئی نہیں

پتا نہیں کیوں؟

مفتی محمد معاویہ اسماعیل ۔ مخدوم پور

میری کمپنی، جہاں میں کام کرتا تھا، میرے گھر سے تقریباً پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ کمپنی کی جانب سے بہترین سہولیات سے آراستہ رہائش مہیا ہونے کے باوجود میں رات کو گھر واپس آنا ہی پسند کرتا تھا۔ کمپنی کی طرف سے دیے گئے گھر میں بچوں کو اپنے ساتھ بھی نہیں رکھ سکتا تھا، کیوں کہ اس سے ان کی تعلیم کے متاثر ہونے کا بہت بڑا مسئلہ تھا۔ کمپنی کا کیا پتا کہ کس وقت فارغ کر دیں، بار بار اِسکول بدلنا بھی اچھی بات نہیں ہے۔

اکیلے گھر میں رہنا بھی مجھے پسند نہیں تھا، اس وجہ سے میں روزانہ اپنے ذاتی گھر آجانا ہی بہتر سمجھتا تھا۔ گاڑی اپنی تھی، مناسب رفتار میں گاڑی چلاتے ہوئے میں آدھے گھنٹے سے بھی کم وقت میں گھر پہنچ جاتا تھا۔ دفتر کا وقت شام پانچ بجے ختم ہوتا تھا۔ نکلتے نکلتے ساڑھے پانچ بج جاتے تھے اور میں تقریباً چھے بجے کے قریب گھر پہنچ جاتا تھا۔

وہ دسمبر کا مہینا تھا۔ شدید سردی کے دن تھے۔ سورج ان دنوں نکلنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا اور رہی سہی کسر چند دن سے مسلسل ہوتی موسلا دھار بارش نے پوری کر دی تھی۔ دو دِن تو شدید بارش کی وجہ سے میں نے دفتر کی چھٹی کر لی تھی، مگر بارش تھی کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی، ہر دو تین گھنٹے کے وقفے کے بعد پھر شروع ہو جاتی اور پانچ چھے گھنٹے مسلسل جاری رہتی۔

دو دِن کی چھٹی کے بعد میں نے دفتر جانے کا ارادہ کر لیا۔ بیگم نے ا... بار تو منع کیا کہ بارش ہے، نہ جائیں، مگر ایک تو سال کے اختتام کی وجہ سے ان دنوں کام بہت زیادہ تھا، پھر میں پہلے ہی دو چھٹیاں کر چکا تھا۔ بہرحال، میں نے دفتر جانے کا پکا عزم کر لیا۔

’’چلیں، آپ جا رہے ہیں تو اِحتیاط سے جایئے گا اور جلدی واپس آنے کی کوشش کیجیے گا۔‘‘

میرے عزمِ مصمم کو دیکھ کر بیگم نے کہا اور میں سلام کر کے دفتر کے لیے نکل گیا۔ واپسی پر جلدی نکلنے کے ارادے اور کوشش کے باوجود بھی مجھے نکلتے نکلتے شام کے سوا چھے بج گئے۔ ہر طرف موسلا دھار بارش کی وجہ سے تقریباً اندھیرا چھا چکا تھا۔ میں اللہ کا نام لے کر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

عام طور پر بہار چوک سے میں ثمن آباد والی سڑک کی طرف مُڑ جاتا تھا۔ یہ راستہ اگر چہ ذرا لمبا تھا، مگر صاف سڑک کی وجہ سے میں ہمیشہ اسی راستے سے گھر جانے کو ترجیح دیتا تھا، جب کہ اگر میں شمس نگر والے راستے سے گھر جاتا تو جلدی پہنچ سکتا تھا، مگر شمس نگر والی سڑک بہت ہی زیادہ خراب ہو چکی تھی، لیکن آج جیسے ہی میں بہار چوک پہنچا تو ایک لمحے کے لیے میں تذبذب میں پڑ گیا کہ کس راستے سے گھر جایا جائے؟ ثمن آباد کے راستے سے یا شمس نگر والے راستے سے۔

وقت کافی بیت چکا تھا اور بارش بھی مسلسل جاری تھی، لہٰذا میں کافی عرصے ... شمس نگر والے راستے سے گھر کو ہو لیا۔ تھوڑی دور آگے ایک پل آتا تھا، جس

سے پار ہو کر کچھ راستہ نہر کے کنارے کنارے جاتا تھا۔

سڑک چوڑی تھی، مگر تھی خراب۔ بارش کی وجہ سے رش بھی نہیں تھا۔ میں آہستہ آہستہ اور احتیاط سے گاڑی چلاتے ہوئے اپنے راستے پر گام زن تھا۔

پل پار کرتے ہی مجھے سڑک کے کنارے ایک نوجوان نظر آیا جو ساتھ کھڑی موٹر سائیکل کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ ایک لمحے کو میرے دل میں خیال آیا کہ شاید بے چارے کی موٹر سائیکل خراب ہوگئی ہے، پھر سردی بھی ہے۔ موسم کی خرابی اور اِس اندھیرے میں یہ بے چارہ، کیسے اپنے گھر پہنچے گا۔ پہلے تو میں تذبذب میں پڑ گیا کہ کیا کیا جائے۔ اس وقت کے حالات بھی کسی کی مدد کرنے کی ہمت نہیں دیتے تھے۔

خیر، کچھ سوچ بچار کے بعد اَز راہِ خیر خواہی میں نے گاڑی اس کی موٹر سائیکل کے قریب روک دی۔ اچھی طرح اپنی گردن اور چہرے کے اردگرد مفلر لپیٹ کر میں نے گاڑی کا شیشہ نیچے کیا تو وہ نوجوان تیزی سے میری طرف لپکا۔

''سر! میری مدد کریں پلیز! میری موٹر سائیکل بیچ راستے میں خراب ہوگئی ہے۔ میں کافی دیر سے اسے ٹھیک کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، مگر سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس میں کیا مسئلہ ہے؟''

میں جلدی سے نیچے اترا، موٹر سائیکل کی چابی لگائی تو ایک ہی کِک میں موٹر سائیکل اسٹارٹ ہوگئی۔

''اس میں تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے!''

میں نے حیرت سے نوجوان کی طرف دیکھا تو اُس کے رومال سے ڈھکے ہوئے چہرے سے بھی اس کی معنی خیز مسکراہٹ واضح طور پر میں نے دیکھ لی۔ ایک لمحے کے لیے تو میں ششدر رہ گیا کہ کہیں میرا مدد کرنے کا فیصلہ غلط تو نہیں تھا۔ ابھی میں یہی سوچ ہی رہا تھا کہ وہ نوجوان گویا ہوا:

''سر! دراصل بات یہ ہے کہ میری موٹر سائیکل خراب نہیں ہوئی۔ میں ڈاکوؤں کے ایک گروہ کا فرد ہوں، جنھوں نے یہاں سے آگے تقریباً آدھے کلومیٹر کے فاصلے پر راستہ بند کیا ہوا ہے اور میری یہاں ڈیوٹی ہے کہ جیسے ہی کوئی گاڑی وغیرہ یہاں سے گزرے میں اپنے ساتھیوں کو خبر کر دوں، تاکہ وہ گاڑی کے پہنچے سے پہلے ہی ہوشیار ہو جائیں، مگر جب آپ کی گاڑی آئی تو پتا نہیں مجھے کیا ہوگیا! نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے آپ کو سب کچھ بتا دیا ہے، پتا نہیں کیوں؟ میری خود سمجھ میں نہیں آ رہا، حالاں کہ اس طرح کرنے سے میں نے اپنے آپ کو خطرے میں ڈال لیا ہے، مگر پھر بھی ایسا کرنے پر میرا ضمیر مطمئن ہے، لہٰذا سر پلیز! آپ یہاں سے آگے جانے کے بجائے واپس چلے جائیں۔ ثمن آباد والا راستہ صاف ہے، اس طرف سے نکل جائیں۔ یہ راستہ مختصر ضرور ہے، مگر خطرات سے خالی نہیں ہے۔''

یہ کہہ کر وہ نوجوان جلدی سے موٹر سائیکل پر بیٹھ گیا اور گیئر لگاتے ہوئے بولا:

''سر! ایک بات اور بھی ذہن میں رکھیے، کبھی بھی شام کے بعد اِس راستے سے آنے کی کوشش نہ کریں، ہم اکثر اِسی راستے پر ہی ہوتے ہیں۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور چلا گیا۔ میں ہکا بکا اسے دیکھتا رہ گیا، پھر مجھے جیسے ہوش آ گیا۔ میں جلدی سے گاڑی کی طرف لپکا اور چند ہی لمحوں میں گاڑی موڑ کر دوسرے راستے کی طرف نکل گیا۔

اس وقت سے اب تک میرے ذہن میں اُلجھن ہے۔ اس واقعے کو کئی سال بیت چکے ہیں۔ میری ترقی ہو چکی ہے اور اَب میری ڈیوٹی میرے ہی علاقے میں کمپنی کی بنی نئی برانچ میں ہے، مگر آج تک میری وہ اُلجھن ختم نہیں ہوئی کہ کیوں اس ڈاکو نے میرے ساتھ خیر خواہی کی!؟ یہ بات میں آج تک نہیں سمجھ سکا۔

ہاں، البتہ ایک بات میرے ذہن میں آئی کہ ہو سکتا ہے کہ یہ آیۃ الکرسی کی برکت ہو، جس کی وجہ سے اللہ پاک نے میری حفاظت فرمائی۔ ہاں واقعی یہی وجہ ہوگی، کیوں کہ میری الحمدللہ عادت ہے کہ میں گاڑی میں بیٹھتے ہی سفر کی دعائیں اور آیۃ الکرسی ضرور پڑھتا ہوں۔

وہ دن اور آج کا دِن، میں کبھی بھی شمس نگر والے راستے سے گھر نہیں گیا۔ اگر کبھی جانا ہوا بھی تو عصر سے پہلے اس راستے سے گزرنے کی کوشش کرتا ہوں اور اِس بات سے میں اکثر لوگوں کو آگاہ بھی کر چکا ہوں کہ اس راستے سے شام کے بعد نہ جایا کریں۔

البتہ ابھی کچھ دن پہلے سننے میں آیا تھا کہ پولیس نے گشت کرتے ہوئے اسی راستے سے کچھ ڈاکو گرفتار کیے ہیں، شاید یہ وہی ہوں۔ اُس وقت سے پولیس نے اس راستے پر اپنی ایک چیک پوسٹ بھی بنا لی ہے۔

اللہ کا شکر ہے کہ اب وہاں کوئی نہیں لٹتا۔ الحمدللہ علیٰ ذلک!

''وجوہات تو بہت تھیں، مگر اصل اور فوری وجہ اس 1857ء کی جنگ کی ایک ہی تھی۔'' دادا جان نے دُکھی ہو کر کہا۔

''فوری وجہ یہ تھی کہ انگریز اپنی فوج میں چھوٹے سپاہیوں کے طور پر زبردستی ہندو اور مسلمانوں کو بھرتی کرتے تھے۔ انھیں جب ایسے کارتوس دیے گئے جن کے منہ پر گائے اور سؤر کی چربی ہوتی تھی، جسے منہ سے کاٹنا پڑتا تھا تو اِس سے مسلمان اور ہندو، دونوں ہی کے دینی جذبات بھڑک گئے۔ انھوں نے انگریزوں پر حملہ کر دیا اور 1857ء کی جنگ شروع ہوگئی، جسے انگریز بڑے غرور سے ''غدر'' کا نام دیتے ہیں۔

''اچھا، میں سمجھ گیا۔ گائے کو ہندو مقدس مانتے ہیں اور ہم مسلمانوں کے مذہبِ اسلام میں سؤر حرام ہے، اس لیے وہ گائے کی چربی پر بھڑک اُٹھے اور مسلمان حرام سؤر کی چربی پر منہ لگانے سے بھڑک اٹھے ہوں گے، ہے نا!؟'' قاسم نے بے ساختہ کہا۔

''بالکل ٹھیک! اب آگے سنو۔'' دادا جان نے کہا۔

''مگر پہلے یہ بتائیں کہ بہادر شاہ ظفر نے یہ جنگ ہونے کیوں دی؟ انگریزوں کو سمجھایا نہیں انھوں نے؟'' صبوحی نے حیرت سے کہا۔

''بیٹی! بہادر شاہ ظفر کو تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ان غنڈے انگریزوں نے اپنی دولت اور سیاست کی چال بازی سے اپنا غلام ہی بنا لیا تھا، لہٰذا بادشاہ اور اُس کا خاندان 1837ء سے 1857ء تک بیس سال انگریز کے مقرر کیے ہوئے وظیفے پر گزارا کرتے رہے تھے۔ اس کے بعد

اَنگریز نے بہادر شاہ ظفر کو جیل میں ڈال دیا اور اُن کے تمام بیٹوں (گیارہ بیٹوں) کو قتل کر ڈالا۔ مزید ظلم یہ کیا کہ ایک بڑے تھال میں گیارہ بیٹوں کے کٹے ہوئے سر کپڑے سے ڈھک کر بہادر شاہ ظفر کو بھیج دیے۔ سوچو، بہادر شاہ کا کیا حال ہوا ہوگا؟ پھر انگریزوں نے شہزادوں کے کٹے ہوئے سروں کے تھال سے کپڑا ہٹا کر قہقہے لگائے اور بولے:

''یہ یکم اپریل فول ہے۔''

انگریز یکم اپریل کو کسی نہ کسی کو دھوکا دے کر بے وقوف بنانے کا مذاق کیا کرتے تھے۔ یہ اپریل کی پہلی تاریخ تھی جب بادشاہ کو کھانے کے تھال میں اس کے بیٹوں کے سر پیش کیے گئے تھے۔''

''بہادر شاہ اور اُن کے بیٹوں کو فرار ہو کر جنگلوں میں نکل جانا چاہیے تھا اور اُن سازشی انگریزوں سے آخری وقت تک لڑائی کرنی چاہیے تھی!''

''بیٹے! ان کا ذہن سیاست اور حکومت والا تھا، جہاد والا نہ تھا۔ حد یہ تھی کہ مسلمان فوج اور مجاہدین نے بہادر شاہ سے کہا کہ آپ صرف نام کے ہی سہی، مگر ہمارے لیے ایک متحد حاکم اور بادشاہ کے طور پر جہاد کا صرف حکم ہی جاری کر دیں، تاکہ سب زخمی مسلمان ریاستیں متحد ہو کر ایک پرچم تلے جنگ لڑیں، مگر بہادر شاہ ظفر یہ بھی نہ کر سکے۔

''یہ تو بہت دکھ کی بات ہے دادا ابو!؟'' صبوحی نے غم زدہ ہو کر کہا۔

''بیٹی! جو قوم غلامی قبول کر کے جہاد چھوڑ دے۔ لوٹ ماری اور عیاشی کرے، اس کا یہی

ڈاکٹر صفیہ سلطانہ صدیقی۔ کراچی

آزادی کا سورج ۳

انجام ہوتا ہے۔ یہ سب بادشاہ تو رعایا کا خیال بھی رکھتے تھے۔ انھیں خوش حال بھی رکھتے تھے، مگر اِن کا جرم یہ تھا کہ دین سے دور ہو کر عیش کرتے، ناچ گانا، شراب اور غفلت نے ''شکاری انگریزوں'' کے جال میں انھیں قید کر ڈالا اور یہ کچھ بھی نہ کر سکے۔

میرے بچو! اُس وقت کے نازک مزاج سیاست دان، جہاد اور قتال سے بھاگے اور اُنھیں کوئی فائدہ نہ ہوا۔'' دادا جان نے کہا۔

''پھر تو ہمیں بھی، ہر بچے بچی کو دفاعی فوجی ٹریننگ دینی چاہیے۔ سب کو تیراکی، نشانہ بازی اور جوڈو کراٹے آنے چاہییں۔ انسان جنگی حالات میں اپنی حفاظت تو کر سکے نا!'' صبوحی نے سوچتے ہوئے کہا۔

''ہاں اور کیا! ہماری قوم تو خود غافل ہے، اگر جنگ ہوگئی تو بم کے دھماکوں سے جو بچ جائیں گے، ان کے لیے قید ہو کر سر کٹنے یا لُٹ جانے سے اچھا ہے کہ لڑتے لڑتے جان دے دیں یا مقابلہ کر کے فتح پائیں۔'' قاسم بولا۔

''بالکل!'' دادا جان بولے۔

''دیکھیں نا؟ شہزادوں کو تو غفلت میں اندازہ ہی نہ ہوا کہ چپکے چپکے مُلکی حالات خراب ہو رہے ہیں؟ وہ تو یہی سوچتے رہے کہ اب صدر، وزیر اعظم کون بنے گا؟ یہی لڑائی چل رہی تھی اور ملک کی تجارتی کمپنی، ایسٹ انڈیا، مگرمچھ بن کر اُنھیں کھا گئی، جسے خود اُنھوں نے اپنے تالاب میں پالا تھا!'' قاسم نے دکھ سے کہا، اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

''اوہو بھیّا! صدر، وزیر اعظم نہیں، بادشاہ اور اُس کے بہت سے وزیر ہوتے تھے اس زمانے میں۔'' صبوحی نے تصحیح کی اور پھر دادا جان سے بولی:

''1857ء میں ''جنگ آزادی'' ہوئی تھی، وہ جنگ مسلمانوں کی کس سے ہوئی تھی؟''

''بیٹی! یہ جنگ انگریزوں سے ہوئی تھی، کیوں کہ انھوں نے پورے ہندوستان (آج کا پورا برصغیر) پر ''برٹش ہند'' کے نام سے اپنی حکومت بنالی تھی اور وہ سب قوموں پر ظلم کر رہے تھے، مگر وہ مسلمانوں پر زیادہ سنگین مظالم ڈھاتے تھے، اس لیے کہ انھوں نے حکومت مسلمانوں سے چھینی تھی اور اُنھیں یہ خوف تھا کہ مسلمان بہادر قوم ہیں، اگر یہ بیدار ہو گئے تو نجانے ان کی بہادری ہمیں کتنا تباہ کر دے گی؟ چناں چہ اس خوف سے وہ مسلمانوں کو کمزور اور بے عزت کرنے کا ہر طریقہ اختیار کر رہے تھے۔''

''تو کیا مسلمان بیدار ہو گئے تھے؟'' قاسم نے حیرت سے پوچھا۔

''بیٹے! جب کسی غافل یا سوئے ہوئے شخص پر چاقو سے وار ہوں گے تو وہ اٹھے گا نا! مگر باقی قوموں کی ہمت ٹوٹ چکی تھی۔ مسلمانوں نے ان سب کے حوصلے بھی بحال کیے۔

یہ مسلمان مجاہدین تھے، پھر اُن کے ساتھ مسلم ہندوستانی فوج بھی (انگریزوں سے باغی ہو کر) مل گئی اور ہندو قوم کے ساتھ دیگر اقوام، راجپوت اور جاٹ بھی 1857ء کی جنگ آزادی میں شامل ہو گئے، کیوں کہ مسلمانوں کے ماتحت رہ کر وہ حفاظت، سکون اور خوش حالی میں رہتے آئے تھے، مگر بیس برس سے، (1837ء سے) انگریزوں نے بادشاہ کو ہی اپنا وظیفہ خوار بنا دیا تھا، اس وجہ سے حالات بد سے بدتر ہو گئے تھے۔''

''اور سکھ لوگ! وہ نہیں تھے جنگ میں؟'' صبوحی نے سوچتے ہوئے کہا۔

''نہیں اٹھارہ سال پہلے انگریزوں کا ساتھ دے کر سکھ قوم نے بالاکوٹ پر قبضہ کیا تھا اور مجاہدین کو ''غداروں'' کی وجہ سے وہاں شکست ہوگئی تھی۔ لوگوں نے سیّد احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ اور اُن کے شاگردوں کی بات نہ مانی، نہ جہاد کی اچھی تیاری کی، نہ نظم وضبط کی اہمیت سمجھی، پھر انگریزوں نے غداروں سے کام لیا اور کم تعداد کے بے سروسامان مجاہدوں پر وحشی سکھوں کے ذریعے حملہ آور ہو کر قابو پالیا۔ یوں سکھ اٹھارہ برس سے بالاکوٹ پر قابض اور حکمران تھے۔

سکھ، انگریزوں کے ایسے گہرے ساتھی تھے کہ کسی سے مال کے عوض رقم نہیں لیتے تھے، بل کہ وہ ظالم سکھ مسلمانوں کے کٹے ہوئے سر کا معاوضہ مانگتے تھے۔ وہ تو 1849ء میں ''وِلزلی'' نے جب سکھوں کو مزہ چکھانا شروع کیا تب سکھوں کی آنکھیں کھلیں اور اُنھیں معلوم ہوا کہ انگریزوں نے انھیں بڑی مہارت سے اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا تھا اور اَب سکھوں کو بھی اندازہ ہوا کہ جب انگریز کو اُن سکھوں کی ضرورت نہ رہی وہ ان سکھوں کی قوت کو بھی ختم کر دیں گے۔''

''دادا جان! 1857ء کی جنگ آزادی کا پھر کیا ہوا؟'' صبوحی نے بے چینی سے پوچھا۔

''جنگ ہوگئی، مگر ہمارا دشمن دو سال نہیں، دو سو سال سے اتنی تیاری کر چکا تھا کہ اس کے پاس اسلحہ، فوج، تربیت اور ہر طرح کا سامان بہت زیادہ تھا اور وہ جو ''قسمت آزمائی'' کے بہانے کنگال فقیروں کی طرح 1613ء میں ہندوستان (برصغیر) کے حکمران سے ایک تجارتی کوٹھی کی بھیک مانگنے آئے تھے، ان کی طویل سازش رنگ لے آئی تھی! صاف دل مہربان مسلمانوں کی غفلت اور عیش وعشرت نے انھیں دین داری اور جہاد سے بہت دور کر دیا تھا۔''

''داداجان! یہ تو آپ نے پہلے بھی بتادیا تھا، آگے بتائیں نا!''

قاسم نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

''مسلمان، ہندو اور ہندوستان کی متحدقومیں، یہ سب مل کر بھی جنگ آزادی میں ہار گئے!'' داداجان نے آہستہ سے کہا۔

''اتنے لوگ مل کر بھی انگریز سے ہار گئے؟'' صبوحی نے حیرت سے کہا۔

''اس وجہ سے ہار گئے کہ مسلمان لیڈر تو تھے، مگر آپس میں ایک دوسرے کو وقت پر اعتماد میں لینے کے بجائے الگ الگ لڑتے رہے، کسی کو صورتِ حال پہلے سمجھ میں آئی کسی کو بعد میں۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ پہلے سب آپس میں اتفاق کرتے، پھر جنگ شروع کرتے، تب کام یابی ضرور ہوجاتی، یعنی نظم وضبط نہ تھا، بس اچانک فیصلہ ہوا اور جنگ چھیڑ دی گئی! قوم کو صورتِ حال سمجھنے میں وقت لگا، مگر جب تک جنگ کا پانسا پلٹ چکا تھا۔

جنگ کے لیے حکمتِ عملی اور سمجھ داری سے آغاز کرنا چاہیے، جذبات سے اٹھ کر بغیر تیاری کے نہیں۔ عام مسلمانوں نے فوجی تربیت نہیں لی تھی، جب کہ فوجیوں کے پاس اسلحہ اور خوراک بھی نہ تھا اور ماضی کے اچھے حالات میں انھوں نے اپنے دشمن ملک میں اپنی کوئی تجارت قائم نہ کی تھی جو انھیں بھی دشمن کے بارے میں معلومات ہوتیں اور دشمن کی کمزوریاں معلوم ہوتیں۔

ہم آج بھی انگریزوں کو اچھا ہی سمجھتے ہیں اور اُن کی کمزوریاں ہمارے سامنے کب ہیں؟ ان انگریزوں نے ہندوستان میں قدم جما کر بدترین لوٹ مار، قتل و غارت گری مچا رکھی تھی۔ آج بھی ہمارے ہاں کے لوگ وہاں نوکری کے لیے جاتے ہیں۔ گھر بار، اپنوں کو، وطن کو، سبھی کو چھوڑ کر جاتے ہیں، حالاں کہ ان کی دولت اور شان، سب ہمارے ہی لوٹے ہوئے مال سے بنی ہے۔ ان کے کارخانے چل ہی نہیں سکتے تھے اگر اِنتہائی زرخیز ہندوستان سے خام مال انھیں نصیب نہ ہوتا!''

''داداجان! مجھے یقین ہے کہ اگر ہمارے لوگ برطانیہ میں تجارت شروع کرتے تو بہت سے لالچی غدار وہاں انگریزوں میں بھی تلاش کر لیتے، کیوں کہ یہ انگریز دولت کے بہت ہی لالچی لوگ ہیں اور بابا کہہ رہے تھے کہ لالچی یا خودغرض انسان اپنے باپ، بھائی اور ماں کا بھی دوست نہیں ہوتا۔'' قاسم نے کہا۔

''ہاں قاسم! یہ بات بالکل درست ہے۔ اگر ہماری کمپنیاں برطانیہ میں قائم ہوتیں تو مسلمانوں سے مال حاصل کرنے کے لیے بہت سے انگریز اپنے لوگوں اور ملک سے غداری کرتے، یہ بہت لالچی اور خودغرض قوم ہے۔''

''بل کہ لُوٹ مار کرنے والے مکّار اور ظالم لوگ ہیں یہ انگریز!'' صبوحی نے دانت پیس کر کہا۔

''داداجان! اگر آج بھی کوئی ہمارے ملک میں آکر تجارتی کمپنی کھول لے تو کیا وہ ایسٹ انڈیا کمپنی جیسی سازش بن سکتی ہے؟'' قاسم نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

''ہاں بالکل بن سکتی ہے! اگر ہماری حکومت کسی غیر ملکی کو بلاوجہ کی آزادی اور مختاری دے دے اور وہ ہماری قوم کو اپنا ملازم بنالیں، مگر ہمارے لوگ ان کے ملک میں اپنی کمپنیاں نہ کھولیں تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے حالات آرام سے پیدا کیے جاسکتے ہیں!'' داداجان نے بتایا۔

''اُف خدایا! ہائے میرے سر میں درد ہوگیا ہے! کہانی ختم ہوگئی داداجان!؟'' صبوحی نے سر پکڑ لیا۔

''لو، کہانی تو اَب شروع ہوئی ہے۔ یہ تو ''ابتدائیہ'' تھا میرے بچو!'' داداجان اداسی سے بولے۔

''پتا نہیں، ابھی اور کتنی دُکھ کی باتیں سننا باقی ہیں؟'' قاسم نے سرد آہ بھر کر کہا۔

''انجان لوگ انجانے میں مارے جاتے ہیں، اس لیے دکھ جتنا بھی ہو، حقیقت کو جان لینا چاہیے۔ آپ حالات کو اُسی وقت بدل سکتے ہیں جب حالات آپ کو معلوم ہوں۔ صبوحی کے سر میں درد ہے، اس لیے باقی باتیں کل!'' داداجان اُٹھ کھڑے ہوئے۔

''نہیں نہیں، ہمیں بتائیں، میں ٹھیک ہوں داداجان!'' صبوحی نے داداجان کا ہاتھ پکڑ کر واپس بٹھالیا۔ داداجان واپس بیٹھ گئے۔

''میرے بچو! ذرا دِل تھام کر سنو، کیوں کہ 1857ء کی جنگ کے بعد تمام مظالم مسلمانوں پر توڑے گئے۔ ایک تو اِس وجہ سے کہ انگریز نے اقتدار مسلمانوں کی حکومت کو دِیمک کی طرح دو سو برس چاٹ کر حاصل کیا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ان کا خیال تھا کہ یہ مسلمان تو جہاد اور شہادت کی موت کو اپنی زندگی سے افضل سمجھتے ہیں، جب کہ ان کے علاوہ کسی میں بھی اتنی ہمت نہیں ہے کہ ہمارے سامنے کھڑا ہوسکے، اس لیے اقتدار سلامت رکھنا ہے تو اِن مسلمانوں کو کچل ڈالو۔''

''داداجان! اکبرالٰہ آبادی، الطاف حسین حالی اور علامہ اقبالؒ وغیرہ کہاں تھے جب قوم کے حالات بگڑ رہے تھے؟'' قاسم نے سوچتے ہوئے کہا۔

''شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ، سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے بعد اُنھی کے شاگردوں نے مسلمانوں کو بیدار کیا۔ اکبرالٰہ آبادی اور مولانا حالی اس کے کچھ بعد کے زمانے کے ہیں، لیکن اکبرالٰہ آبادی کو سرسید اور حالی سے اختلاف تھا!''

''داداجان! وہ کیوں؟ اور کیا اختلاف تھا؟'' دونوں نے حیرت سے ایک آواز میں کہا۔

''سرسید احمد خان کو انگریزوں نے ''سر'' کا خطاب دیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سید احمد خان نے قوم کو انگریزی زبان اور انگریزی تعلیم سیکھنے کی ترغیب دی تھی، جب کہ اکبرالٰہ آبادی ان تمام مصیبتوں کا حل یہ سمجھتے تھے کہ اگر مسلمان دین پر چلیں، غفلت کا پردہ چاک کریں، مجاہدانہ زندگی اختیار کریں اور متحد ہو جائیں تو برطانیہ کو دیس نکالا دے سکتے ہیں۔ اگر جنگ آزادی سے پہلے منتشر اور بکھرے ہوئے مسلمان منظم ہو جاتے تو 1857ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں کو شکست دے کر ہندوستان سے نکال باہر کرتے، مگر انگریزوں نے اسلامی جہاد سے خوف زدہ ہو کر اور بہت زیادہ نقصان اُٹھا کر مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کا فیصلہ کیا۔

انھوں نے مرزا غلام احمد قادیانی نامی ایک شخص کو تیار کیا، جس نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا اور انگریزوں سے جہاد کو حرام قرار دیا۔ مسلمانوں میں پھوٹ ڈال کر اُنھیں تقسیم کر کے مسلمانوں کے ذہن خراب کیے۔ مسلمان چوں کہ قرآن و حدیث کو چھوڑ کر بہت زیادہ لغویات، رقص و موسیقی، شاعری اور عیّاشی میں مبتلا ہو چکے تھے، اس وجہ سے دین سے دور تھے، چناں چہ بغیر علم کے انھیں جو بات اچھی اور ٹھیک لگتی وہ اُسی کے پیچھے چل پڑتے، لہٰذا مسلمانوں کے درمیان جھگڑے کھڑے کیے گئے، پھر کچھ لوگوں کو پیسے دے کر خریدا گیا، غداری کروائی گئی، ''انگریز کے خلاف جہاد جائز نہیں ہے، کیوں کہ وہ مذہبی آزادی دیتے ہیں۔'' کے فتوے پھیلائے گئے، ہندوؤں کو اختیارات دے کر مسلمانوں پر غلبہ دیا گیا۔ مرہٹوں اور سکھوں کو مسلمانوں پر گویا کتوں کی طرح چھوڑ دیا گیا۔ انگریزوں کے تابع دار ہندو، سکھ اور مرہٹے، مسلمانوں پر حملہ آور ہو گئے۔

اس کے علاوہ مسلمانوں کو معاشی طور پر تباہ کر کے مفلس اور احساس کمتری کا شکار بنایا گیا۔ اپنے تعلیمی نظام کے ذریعے انگریز اور انگریزی کی برتری کو ثابت کیا گیا۔ چناں چہ جو مسلمان انگریزوں کے اداروں میں تعلیم پاتے وہ گردن اکڑا کر غیر انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں کو حقیر، فقیر اور جاہل سمجھتے تھے۔''

''داداجان! ایسا تو آج کل بھی ہوتا ہے!'' صبوحی نے حیرت سے کہا۔

''جی میرے بچو! اِسی لیے اقبال نے فرمایا تھا:

پہن کے تاج بھی ہم غیروں کے غلام رہے
فلک پہ اُڑ کے بھی شاہیں ، اسیرِ دام رہے

''اسیرِ دام کیا ہوتا ہے؟'' قاسم نے پوچھا۔

''اسیر کا مطلب ہوتا ہے ''قیدی'' اور دام ''پھندے'' کو کہتے ہیں، یعنی آزاد ہیں، مگر آزاد فضا میں اُڑ کر بھی اپنے پروں پر انگریزوں کا جال رکھتے ہیں، کیوں کہ انھیں غلام رہنے کی عادت جو پڑ گئی ہے۔

دیکھو میرے بچو! انگریز گندی قوم ہے، مگر انگریزی تو ایک زبان ہے۔ ہم اسے اگر ایک زبان کی طرح پڑھیں تو یہ ہمیں کوئی نقصان نہیں دے سکتی، لہٰذا اِسکولوں میں بھی انگریزی کو پڑھانا چاہیے، اوڑھانا نہیں چاہیے کہ بچہ اردو بولے تو جرمانہ لگ جائے۔

بقیہ صفحہ نمبر 43 پر

حاتم طائی کی بیٹی

بارگاہِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں

نعمان حیدر حامی۔ بھکر

ربیع الاول کا بابرکت مہینا تھا۔ دوپہر کے وقت احمد اور اُس کی بڑی بہن رابعہ اپنے کتب خانے میں بیٹھ کر مطالعے میں مصروف تھے۔ ان کی دادی شمیم درود شریف کا وِرد کر رہی تھیں۔ اتنے میں احمد کتب خانے سے نکلا اور دادی کے پاس آ کر کہنے لگا:

''دادی اماں! دادی اماں!''

دادی شمیم، دونوں بہن بھائی، رابعہ اور احمد سے بہت پیار کرتی تھیں، کہنے لگیں:

''جی میرے پیارے بچے! آ جا، آ جا۔''

دادی اماں نے احمد کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور کہا: ''احمد بیٹا! کیا مسئلہ ہے؟''

احمد نے کہا: ''دادی اماں! میں ابھی کتب خانے کی ایک کتاب میں اسلام میں بیٹی کے مقام کے متعلق پڑھ رہا تھا۔ اس میں حاتم طائی کی بیٹی کا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش ہونے کا واقعہ بھی لکھا ہوا تھا۔ دادی اماں! یہ حاتم طائی کون تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی بیٹی سے اتنا اچھا سلوک کیوں کیا؟''

اتنے میں رابعہ بھی احمد کے سوالات کا شور سن کر کتب خانے سے باہر آ کر دادی اماں کے سامنے بیٹھ گئی۔

دادی اماں کہنے لگیں: ''بیٹا! چلو پھر آج میں آپ دونوں کو حاتم طائی اور اُن کی بیٹی کا تعارف کرواتی ہوں کہ وہ کون تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے اچھا سلوک کیوں کیا؟

میرے پیارے بچو! حاتم طائی جاہلیت کے دور میں اپنی غیر معمولی سخاوت کی وجہ سے پورے عرب میں اس قدر مشہور تھے کہ اگر کسی کو سخاوت کی مثال دینی ہوتی تو کہتے کہ فلاں شخص حاتم طائی کی طرح سخی ہے۔ وہ اپنا سب کچھ لوگوں کو دینے میں مصروف رہتے تھے۔ عہدِ اسلام سے کچھ عرصہ قبل ہی حاتم طائی کا انتقال ہوا تھا۔ ان کا ایک بیٹا اور ایک بیٹی تھی۔ بیٹے کا نام عدی بن حاتم اور بیٹی کا نام سفانہ بن حاتم تھا۔

۹ ہجری ربیع الآخر میں ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی سربراہی میں ایک سو پچاس افراد پر مشتمل ایک لشکر بھیجا، تاکہ وہ قبیلہ ''طے'' کے بت خانے کو گرا دیں۔ حاتم طائی کا جس قبیلے سے تعلق تھا اس کا نام قبیلہ ''طے'' تھا۔ اسلامی لشکر نے شہر ''فلس'' میں جا کر بت خانہ گرا دیا۔

اسلامی لشکر نے کچھ اونٹوں، بکریوں اور چند عورتوں کو گرفتار کر کے انھیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں پیش کیا۔ ان عورتوں میں حاتم طائی کی بیٹی سفانہ بن حاتم بھی شامل تھی۔ کسی نے بتایا کہ یا رسول اللہ! یہ حاتم طائی کی بیٹی ہے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سفانہ بن حاتم کو دیکھا تو اُس وقت اس کے سر پر کوئی چادر تک نہ تھی، ننگا سر تھا اور گرفتار حالت میں تھیں۔ پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چادر اُس کے سر پر رکھی۔ انھوں نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے اپنے والد حاتم طائی کی سخاوت کو بھی خوب بیان کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انھیں رہا کرنے کا حکم دیا اور اُنھیں ایک اونٹ بھی عنایت فرما، تاکہ وہ محفوظ طریقے سے واپس اپنے قبیلے پہنچ سکیں۔ حاتم طائی کی بیٹی سفانہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس حسن سلوک کی وجہ سے اسلام قبول کر لیا۔

جب وہ اپنے بھائی عدی بن حاتم کے پاس پہنچیں تو اُسے سارا واقعہ سنایا۔ عدی بن حاتم اپنی بہن کی زبانی حضور علیہ السلام کے خلق عظیم کے متعلق سن کر بے حد متاثر ہوا اور بغیر کوئی امان طلب کیے ہوئے مدینے آ گیا۔ لوگوں نے بارگاہِ نبوت میں یہ خبر دی کہ عدی بن حاتم آ گیا ہے۔ حضور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اے عدی! تم کس چیز سے بھاگے؟ پھر عدی بن حاتم نے کلمہ پڑھ لیا اور مسلمان ہو گئے۔ ان کے اسلام قبول کرنے سے حضور علیہ السلام کو اِس قدر خوشی ہوئی کہ فرطِ مسرت سے آپ کا چہرۂ انور چمکنے لگا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انھیں خصوصی عنایات سے نوازا۔

بیٹا! ہمارے دین اسلام نے بیٹی کو جس قدر حقوق دیے ہیں دنیا کے کسی بھی مذہب میں ان کی مثال ناممکن ہے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام جہانوں کے لیے رحمت بن کر آئے، تاکہ لوگوں کو اِنسانیت کا احترام سکھا سکیں اور دین اسلام کا بول بالا ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد سے پہلے کفار مکہ اپنی لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے، مگر بیٹا! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد سے عورت کو ایک الگ مقام ملا اور اُن کے حقوق کا تحفظ ہوا۔''

احمد اور رابعہ کہنے لگے: ''دادی اماں! آپ کا بہت بہت شکریہ۔''

سوال آدھا جواب آدھا ۲۵

الطاف حسین۔ کراچی

اس کھیل میں چند جملے ہیں، ہر جملہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں کچھ معلومات دی گئی ہیں، جب کہ دوسرے حصے میں اسی طرح کی معلومات آپ سے پوچھی گئی ہیں۔ آپ مطلوبہ معلومات ہمیں ۳۱، اکتوبر تک ارسال کر دیجیے، ہم آپ کو اِس کا انعام روانہ کر دیں گے۔ ایک سے زیادہ درست جوابات موصول ہونے کی صورت میں قرعہ اندازی کے ذریعے تین قارئین کرام کو اِنعام سے نوازا جائے گا۔ کوپن پُر کر کے ساتھ بھیجنا نہ بھولیے گا۔

۱ قرآن مجید کی سورۂ ناس کی چھے آیات کا اختتام لفظ ''ناس'' پر ہوتا ہے..... بتایئے قرآن مجید کی وہ کون سی سورت ہے، جس کی سات آیات کا اختتام لفظ ''مبین'' پر ہوتا ہے؟

۲ ''سیّد البشر'' حضور نبی کریم ﷺ کا لقب ہے..... بتایئے ''سیّد المرسلین'' کون سے پیغمبر کا لقب ہے؟

۳ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ 573ء میں سعودی عرب کے شہر مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے تھے..... بتایئے خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کس سن عیسوی میں مکہ مکرمہ پیدا ہوئے تھے؟

۴ اسلام کے ابتدائی ایام میں نمازِ جمعہ کے لیے ایک اذان دی جاتی تھی..... بتایئے نمازِ جمعہ کے لیے دوسری اذان کا آغاز کس خلیفہ رضی اللہ عنہ کے دور میں ہوا تھا؟

۵ اسلامی دنیا کے عظیم مسلمان سرجن ابوالقاسم الزہراوی کی مشہور ترین کتاب کا نام ''التصریف'' ہے جو 30 جلدوں پر مشتمل ہے..... بتایئے اسلامی دنیا کے ممتاز سائنس دان اور طبیب علی بن رین الطبری کی علم طب پر لکھی گئی کتاب ''فِردوس الحکمت'' کتنی جلدوں پر مشتمل ہے؟

۶ ''معاہدہ جنیوا'' پاکستان اور افغانستان کے درمیان 14، اپریل 1988ء کو جنیوا (سوئٹزرلینڈ) میں طے پایا تھا..... بتایئے ''معاہدہ شملہ'' کن دو ممالک کے درمیان طے پایا تھا؟

۷ ''عروس مشرق'' تھائی لینڈ کے شہر ''بنکاک'' کو کہتے ہیں..... بتایئے ''عروس مغرب'' اٹلی کے کس شہر کو کہا جاتا ہے؟

۸ ''تانبا (Copper)'' ایک کیمیائی عنصر ہے۔ اسے علامت ''Cu'' سے ظاہر کیا جاتا ہے..... بتایئے ''Hg'' کس عنصر کی کیمیائی علامت ہے؟

۹ وہ آلہ جس کی مدد سے بینائی سے محروم افراد اَخبارات اور کتابوں کا با آسانی مطالعہ کر سکتے ہیں ''آپٹوفون'' کہلاتا ہے..... بتایئے ''آڈیوفون'' کس مقصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے؟

۱۰ ''دل بھر جانا'' اردو زبان کا ایک محاورہ ہے، جس کا مطلب ہے: ''اُکتا جانا''۔ آپ بتایئے کہ ''دل بھر آنا'' کا کیا مطلب ہے؟

ڈالر، پاؤنڈ اور جاپانی یَن

رانا محمد شاہد۔ بورے والا

ڈالر(Dollar):

ڈالر دنیا کی سب سے مقبول کرنسی ہے۔ کئی ممالک کی سرکاری کرنسی کا نام ڈالر ہے۔ ان میں امریکا، آسٹریلیا، کینیڈا، نیوزی لینڈ، ہانگ کانگ، سنگاپور، تائیوان اور دیگر ممالک شامل ہیں، البتہ سب سے پرانا ڈالر امریکا کا ہی ہے۔ امریکی ڈالر کو ''$'' کی علامت سے ظاہر کیا جاتا ہے۔

۱۵۲۰ء سے سکے بننے شروع ہوئے، جنھیں ڈالر کا نام دیا گیا۔ پہلے یہ سکہ چاندی کا ہوا کرتا تھا۔ ۱۹۶۵ء تک چاندی کا ڈالر ختم کر دیا گیا۔

دنیا کے مختلف ممالک کی اکثریت عالمی سطح پر ڈالروں میں ہی رقوم کا تبادلہ کرتی ہے۔ آج ڈالر، سکے اور نوٹ، دونوں ہی شکلوں میں موجود ہے۔ زیادہ مالیت اور کم مالیت کے ڈالر کا نوٹ سائز میں مختلف ہوسکتا ہے۔ جیسے ۱۹۲۸ء میں ڈالر 17.42 اِنچ کے سائز میں چھپتا تھا، جب کہ کم مالیت کے ڈالر کا سائز 6.14 انچ تک ہوتا تھا۔ آج کے ڈالر کا سائز مختلف ہے۔ آج ڈالر 12.61 انچ چوڑا، 6.14 انچ لمبا اور 0.0043 انچ موٹا ہوتا ہے۔ یہ تمام نوٹ کاٹن فائبر کے کاغذ پر چھاپے جاتے ہیں۔ ۲۱، اپریل ۲۰۱۰ء سے سو ڈالر کا نوٹ تبدیل کر دیا گیا ہے۔

پاکستان بھی عالمی سطح پر لین دین ڈالروں میں ہی کرتا ہے۔ گزشتہ کچھ عرصے میں ڈالر کی اڑان بہت اونچی ہوگئی ہے، بل کہ حال ہی میں یہ تاریخ کی بلند ترین سطح پر پہنچ گیا ہے، جس کی وجہ سے پاکستان کے واجب الادا قرضوں میں بھی اضافہ ہوگیا ہے۔ آج کل ایک امریکی ڈالر تقریباً ۱۷۰ پاکستانی روپوں کے برابر ہے۔

آکسفورڈ یونی ورسٹی کی ایک تحقیق کے مطابق ڈالر کا ماخذ جرمنی کا ایک قدیم لفظ ''ہوخم'' ہے۔ یہ لفظ چاندی سے مالا مال ''ہاؤخم وادی'' سے موسوم ہے۔ اس چاندی سے بننے والے سکوں کو ''ہاؤخم استھالر'' کہا جاتا تھا، یہ مختصر ہوکر صرف ''تھالر'' رہ گیا اور پھر بگڑتا ہوا ''ڈالر'' کے نام میں تبدیل ہوگیا۔

پاؤنڈ اسٹرلنگ(Pound Sterling):

دنیا کے بہت سے ممالک کی کرنسی پاؤنڈ ہے۔ برطانیہ کی سرکاری کرنسی ''پاؤنڈ اسٹرلنگ'' کہلاتی ہے۔

پاؤنڈ کا تاریخی پس منظر یہ ہے کہ یہ ایک لاطینی لفظ ''پاؤنڈس'' سے نکلا ہے، جو وزن کو کہتے ہیں۔

برطانیہ کے علاوہ مصر، لبنان، سوڈان اور شام میں بھی پاؤنڈ کرنسی کا استعمال ہوتا ہے۔ ڈالر، یورو اور جاپانی یَن کے بعد دنیا میں سب سے

زیادہ لین دین پاؤنڈ اسٹرلنگ میں ہوتا ہے۔ یہ دنیا کی قدیم ترین کرنسی ہے، جسے ایک بادشاہ Offa نے متعارف کرایا تھا۔ Offa ۷۵۷ء کو پیدا ہوا اور تقریباً ۳۹ سال بعد ۷۹۶ء میں انتقال کر گیا۔

ایک پاؤنڈ میں ایک سو پینس (Pence) ہوتے ہیں، جب کہ ایک سکے کو پینی (Penny) کہا جاتا ہے۔ ابتدائی دور میں چاندی کے ۲۴۰ سکے ایک پاؤنڈ کے برابر ہوتے تھے۔

۱۶۹۴ء میں بینک آف انگلینڈ نے پہلی بار کاغذ کا نوٹ شائع کیا۔ ۱۷۵۴ء تک بیس سے ہزار تک کی مالیت کے پاؤنڈ اسٹرلنگ چھاپے جاتے رہے۔ آج کل جو پاؤنڈ اسٹرلنگ ملتا ہے وہ تقریباً ۲۳۵ پاکستانی روپوں کے برابر ہوتا ہے۔ اس کرنسی پر ملکہ برطانیہ کا عکس نمایاں نظر آتا ہے۔

یَن (Yen):

ڈالر اور یورو کے بعد سب سے زیادہ استعمال ہونے والی کرنسی کا نام یَن ہے۔ ین، جاپان کی کرنسی ہے۔ جاپانی یَن کا ماخذ ایک چینی لفظ ہے، جس کا مطلب ہے (Round Object)۔

یَن کو ۱۸۷۱ء میں Meo Ji حکومت نے جاری کیا۔ ابتدا میں یَن ایک سونے کا سکہ تھا، جو 1.5 گرام وزن رکھتا تھا۔ بعد میں اسے چاندی میں تبدیل کر دیا گیا۔ آج ایک سے پانچ سو تک مالیت کے کے سکے دست یاب ہیں اور ایک ہزار سے دس ہزار یَن کرنسی نوٹ کی شکل میں گردش میں ہیں۔

دوسری جنگ عظیم میں جاپان کے حالات کے پیش نظر اُس کی کرنسی بہت گر گئی تھی۔ ماضی میں چین اور ہانگ کانگ کا بھی اس کرنسی پر کنٹرول رہا ہے۔

۱۸۷۰ء کی دہائی میں چاندی کا ایک یَن ہوا کرتا تھا۔ یہ سکے ۱۸۷۳ء میں متعارف کروائے گئے تھے، جب کہ یَن کا نوٹ ۱۸۷۲ء سے شروع کیا گیا۔

آپ ﷺ کے اخلاق

انتخاب: محمد بلال، یوسف خان، (جماعت نہم، سائنس، البدر اسکول، گارڈن ایسٹ کیمپس)

آپ ﷺ صلہ رحمی کرتے تھے۔

آپ ﷺ مقروضوں کا بار اُٹھاتے، غریبوں پر عنایت فرماتے اور مہمانوں کی ضیافت فرماتے تھے۔

آپ ﷺ مصیبت میں لوگوں کے کام آتے تھے، کبھی کسی کی درخواست رد نہیں فرماتے تھے۔

آپ ﷺ برائی کے بدلے میں برائی نہیں کرتے تھے، بل کہ معاف فرما دیتے تھے۔

آپ ﷺ نے کبھی اپنے ذاتی معاملے میں کسی سے انتقام نہیں لیا، کسی کو نہیں مارا۔

آپ ﷺ جب گھر تشریف لاتے تو نہایت خنداں، مسکراتے ہوئے آتے۔

آپ ﷺ دوستوں میں کبھی پاؤں پھیلا کر نہیں بیٹھتے تھے۔

آپ ﷺ باتیں ٹھہر ٹھہر کر فرماتے کہ اگر کوئی یاد رکھنا چاہے تو رکھ سکے۔

آپ ﷺ نرم خو اور مہرباں طبع تھے، سخت مزاج اور تنگ دل بالکل نہ تھے۔

آپ ﷺ کبھی بُرا کلمہ منہ سے نہ نکالتے تھے، بحث مباحثے سے دور رہتے تھے۔

آپ ﷺ ضرورت سے زیادہ بات نہیں کرتے تھے، جو بات کی مطلب کی نہیں ہوتی تھی اس میں نہیں پڑتے تھے۔

آپ ﷺ کسی کے اندرونی حالات کی ٹوہ میں نہیں رہتے تھے۔

آپ ﷺ اگر کسی بات سن رہے ہوتے تو جب تک وہ اپنی بات ختم نہ کر لیتا خاموشی سے سنتے رہتے۔

آپ ﷺ دوسروں کے منہ سے اپنی تعریف سننا پسند نہیں کرتے تھے۔

آپ ﷺ نہایت فیاض، راست گو اور نہایت خوش صحبت تھے۔

آپ ﷺ کو اگر کوئی پہلی مرتبہ دیکھتا تو مرعوب ہو جاتا، لیکن جیسے جیسے آشنا ہوتا جاتا آپ سے محبت کرنے لگتا۔

آپ ﷺ کسی کو بُرا بھلا نہیں کہتے تھے، کسی کی خاطر شکنی نہیں فرماتے تھے۔

آپ ﷺ کسی کی توہین روا نہ رکھتے تھے۔

آپ ﷺ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اظہار تشکر فرماتے تھے۔

آپ ﷺ کے سامنے جو کچھ آتا کھا لیتے تھے، اُس میں عیب نہیں نکالتے تھے۔

آپ ﷺ وقار اور متانت سے گفتگو فرماتے تھے۔

آپ ﷺ کسی سے ملنے کے وقت ہمیشہ پہلے خود سلام اور مصافحہ فرماتے تھے۔

آپ ﷺ سے اگر کوئی شخص کوئی بات کہتا تو اُس وقت تک اس کی طرف سے منہ نہیں پھیرتے تھے جب تک وہ خود منہ نہ پھیر لے۔

آپ ﷺ کسی سے ہاتھ ملاتے تو جب تک وہ خود ہاتھ نہ چھوڑ دے ہاتھ نہیں ہٹاتے تھے۔

(ماخوذ از: سیرت النبی ﷺ، مصنفہ: حضرت مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ)

ناک کا بال

ڈاکٹر الماس روحی۔ کراچی

وہ ایک اسکول کا چپڑاسی تھا۔ اس کا نام حسن دین تھا۔ عمر اُس کی پچاس سال کے لگ بھگ تھی، پھر بھی وہ تنومند نوجوان دکھائی دیتا تھا۔

وہ اپنے سارے فرائض اچھی طرح انجام دیتا تھا۔ پندرہ سالوں میں کبھی کسی طالب علم یا کسی استاد کو اُس سے شکایت نہ ہوئی تھی۔ وہ اپنا کام دیانت داری سے کرتا تھا۔

وہ صبح سویرے اسکول کھلنے سے ایک گھنٹا پہلے اسکول پہنچ جاتا اور اپنی نگرانی میں اسکول کے کمروں کی صفائی کرواتا، ہیڈ ماسٹر صاحب کا کمرا وہ خود صاف کرتا۔ اتنے میں اسکول کی پہلی گھنٹی کا وقت ہو جاتا، وہ گھنٹی بجاتا، پھر ہیڈ ماسٹر صاحب کے دفتر کے سامنے اپنی کرسی پر بیٹھ جاتا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کی پہلی گھنٹی پر وہ فوراً کھڑا ہو جاتا۔

حسن دین ڈاک تقسیم کرتا۔ وہ اسکول کی عمارت، جگہ اور سامان کی حفاظت کرتا۔ اسے اسکول کی ایک ایک چیز سے بہت محبت تھی۔ وہ سادہ لباس پہنتا تھا، لیکن ہمیشہ صاف ستھرا رہتا تھا۔

وہ نماز کا بہت پابند تھا اور صبح سویرے قرآن مجید کی تلاوت بھی کرتا تھا۔

اسکول کے طلبہ اسے بابا حسن دین کے نام سے پکارتے تو وہ بہت خوش ہوتا اور لڑکوں سے ہنسی مذاق بھی کرتا۔ وہ اسکول کے لڑکوں کا ایک اچھا دوست تھا۔ ان پر نظر رکھتا۔ بُرے کام کرنے سے انھیں ٹوکتا۔

وہ انتہائی ایمان داری آدمی تھا، اسی لیے ہیڈ ماسٹر صاحب کی ناک کا بال تھا۔ وہ اس پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ اسکول میں اگر کسی کی کوئی چیز رہ جاتی تو وہ سنبھال کر رکھتا اور اِسکول کے دفتر میں جمع کروا دیتا۔

ایک مرتبہ ہیڈ ماسٹر صاحب سے طالب علموں کی فیس کے پیسوں کا لفافہ اسکول میں رہ گیا۔ بے چارے ہیڈ ماسٹر صاحب بہت پریشان ہوئے۔ حسن دین نے وہ سارے روپے حفاظت سے ہیڈ ماسٹر صاحب کے گھر پہنچائے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب اس کی ایمان داری سے بہت متاثر ہوئے اور اِسکول کے ایک سالانہ جلسے میں اسے پانچ ہزار روپے انعام دیا۔

مشکل الفاظ کے معانی:

۱۔ ناک کا بال (محاورہ): بہت قریب ہونا۔

۲۔ تنومند: صحت مند۔

۳۔ لگ بھگ: اندازاً

۷۔ مغیرہ بن سعید عجلی

حافظ محمد دانش عارفین حیرت۔ لاہور

خلیفہ عبدالملک بن مروان نے حارث کذاب دمشقی کو نبوت کے جھوٹے دعوے کے جرم میں قتل کروایا اور نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنا واقعی ایسا جرم ہے جس کی سزا قتل سے کم نہیں۔

خلیفہ عبدالملک بن مروان کی وفات کے انیس سال بعد ہشام بن عبدالملک خلیفہ بنا۔ ہشام بن عبدالملک نے قریباً بیس سال حکومت کی۔

ہشام بن عبدالملک کی خلافت میں عراق کے گورنر کا نام خالد عبداللہ قسریٰ تھا۔ خالد ایک پکا سچا مسلمان تھا، جو ختم نبوت پر پکا ایمان رکھتا تھا۔ وہ ایک خداترس انسان تھا۔ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق سے عزت و احترام سے پیش آتا، ان کی دادرسی کرتا اور گورنر ہونے کی حیثیت سے عوام کے مسائل حل کرنے کی پوری پوری کوشش کرتا۔

حارث کذاب دمشقی کے بعد نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنے والا اگلا شخص مغیرہ بن سعید عجلی ہے۔ مغیرہ عراق کے گورنر خالد عبداللہ قسریٰ کا ہی غلام تھا۔ چوں کہ خالد ایک خدا ترس انسان تھا، اس لیے اس نے اپنے غلاموں سے بھی نرم رویہ اختیار کر رکھا تھا۔

مغیرہ بن سعید عجلی اپنے آقا کی اس عادت سے فائدہ اٹھاتا اور اکثر اوقات اپنے آقا کی مجلس سے غائب رہتا۔ خالد نے مغیرہ کی یہ عادت دیکھی تو اُس نے مغیرہ کو بلا کر پوچھا:

''کیا بات ہے، تم اکثر میری خدمت سے غائب رہتے ہو؟''

مغیرہ نے جواب دیا:

''میں حضرت امام محمد باقر رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضری دیتا ہوں، اس لیے حضور کی خدمت میں حاضر نہیں ہو پاتا۔''

حضرت امام محمد باقر رحمۃ اللہ علیہ اس زمانے میں ایک مشہور بزرگ تھے۔ ان کا تعلق خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان سے تھا۔

خالد عبداللہ قسریٰ نے جب اپنے غلام مغیرہ بن سعید عجلی کا عذر سنا تو خاموش ہو گیا اور اُسے کچھ نہ کہا۔

مغیرہ بن سعید عجلی جب امام محمد باقر رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اُس نے لوگوں کی امام محمد باقر رحمۃ اللہ علیہ سے عقیدت دیکھی۔ لوگوں کی ان سے عقیدت کو دیکھ کر مغیرہ بن سعید عجلی کے دماغ میں شیطان نے وسوسہ ڈالا اور اُس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوگئی کہ جس طرح لوگ امام محمد باقر رحمۃ اللہ علیہ سے عقیدت و محبت کرتے ہیں، اسی طرح مجھ سے بھی محبت و عقیدت کریں۔

مغیرہ بن سعید عجلی کی یہ خواہش اسی وقت پوری ہو سکتی تھی جب کہ وہ آزاد ہوتا، مگر وہ تو ایک غلام تھا، اس لیے اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ غلام ہوتے ہوئے اپنے گرد لوگوں کا ہجوم اکٹھا نہیں کر سکتا تھا، اس لیے اس کے دل میں ہجوم کی خواہش کے ساتھ ساتھ یہ خواہش بھی پیدا ہوگئی کہ وہ آزاد ہو جائے، مگر آزادی حاصل کرنا اس کے اختیار میں نہیں تھا۔

اس کے آزاد ہونے کی دو ہی صورتیں تھیں، ایک یہ کہ کوئی رئیس آدمی اسے خرید کر آزاد کر دیتا، مگر یہ ناممکن تھا۔ وہ گورنر عراق خالد عبداللہ قسریٰ کا غلام تھا اور گورنر سے رقم کے بدلے کوئی کیسے اس کا غلام خرید سکتا تھا؟ دوسری صورت یہ تھی کہ مغیرہ بن سعید عجلی کوئی غیر معمولی کارنامہ سرانجام دیتا اور اُس کارنامے سے خوش ہو کر گورنر خالد عبداللہ قسریٰ اس کو خود ہی آزاد کر

دیتا، مگر اُس وقت ایسی کوئی صورتِ حال بنتی نظر نہیں آ رہی تھی۔

مغیرہ بن سعید عجلی ایک چالاک اور عیار انسان تھا۔ اس کے دماغ میں نت نئے منصوبے آتے رہتے تھے۔ جب اُس کے دل میں آزادی کی خواہش پیدا ہوئی تو اُس کے دماغ نے کافی سوچ بچار کے بعد ایک منصوبہ بنایا۔ اس منصوبے کے مطابق اس نے چند لوگوں کو کرائے پر حاصل کیا اور اُنھیں راضی کیا کہ وہ انھیں جو بھی حکم دے گا وہ اسے پورا کریں گے۔ ان لوگوں کو رقم سے غرض تھی، اس لیے فوراً ہی راضی ہو گئے۔

مغیرہ بن سعید عجلی نے مناسب وقت کا انتظار کیا، پھر ایک روز اُس نے ان لوگوں کو ایک جگہ اکٹھا کیا اور ابتدائی کچھ باتیں کرنے کے بعد حکم دیا:

''تم لوگ یوں کرو کہ بہت ہی منظم انداز میں یہ خبر پھیلا دو کہ گورنر خالد عبداللہ قسریٰ کی جان کو شدید خطرہ ہے، انھیں کسی بھی وقت قتل کر دیا جائے گا۔''

''اچھی بات ہے۔ ہم آپ کی ہدایت پر پوری طرح عمل کریں گے۔'' ان لوگوں کے سردار نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے، پھر جاؤ اور جا کر یہ خبر شہر میں پھیلا دو۔'' مغیرہ بن سعید عجلی نے مجلس ختم کر دی۔

وہ لوگ چلے گئے۔ ان لوگوں کا پورا ایک گروہ تھا۔ انھوں نے نہایت ہی منظم انداز میں اس بات کو پھیلانا شروع کر دیا:

''کچھ سنا تم نے، گورنر خالد قسریٰ کی جان کو خطرہ ہے، کوئی انھیں قتل کرنا چاہتا ہے۔''

چوں کہ یہ ایک منظم گروہ تھا، اس لیے کسی کو بھی اس جھوٹی خبر کے متعلق شک نہیں گزرا اور نہ ہی کسی کو یہ معلوم ہوا کہ یہ افواہ پھیلانے والا کون ہے؟ جب یہ خبر شہر بھر میں پھیل گئی تو لوگ اس سنی سنائی بات پر تبصرہ کرنے لگے:

''خالد قسریٰ کو کوئی کیوں مارنا چاہے گا؟ وہ تو ایک بھلا انسان ہے۔''

''کوئی تو اُس سے ناخوش ہوگا۔''

''بھلے انسان سے بُرے لوگ ہی ناخوش ہوتے ہیں۔''

غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔

پھر یہ خبر اُڑتے اڑتے پورے شہر میں پھیل گئی اور گورنر خالد عبداللہ قسریٰ کے کانوں تک بھی جا پہنچی۔ اس خبر کو سُن کر وہ کچھ پریشان ہو گیا۔ مغیرہ تو اِسی موقع کی تاک میں تھا۔ اس نے چاپلوسانہ اور خوشامدی لہجے میں خالد قسریٰ سے پوچھا:

''آقا! آپ چند دِنوں سے کچھ پریشان نظر آ رہے ہیں؟ اگرچہ میں آپ کا ایک معمولی سا غلام ہوں، مگر پھر بھی پوچھ رہا ہوں کہ آپ کی پریشانی کی وجہ کیا ہے؟''

خالد عبداللہ قسریٰ نے اسے ٹالنے کے لیے جواب دیا:

''کوئی خاص بات نہیں ہے۔''

مغیرہ بن سعید عجلی نے خوشامدی لہجے میں کہا:

''آقا! خاص بات نہیں تو عام بات ہوگی، لیکن آپ عام بات سے کیوں پریشان ہیں؟''

خالد عبداللہ قسریٰ اپنے غلام کی بات سُن کر مسکرایا اور پھر کہنے لگا:

''تم تو جانتے ہی ہو گے کہ شہر بھر میں میرے قتل کی خبر گردش کر رہی ہے۔''

مغیرہ نے جواب دیا:

''جی حضور! یہ بات میرے علم میں ہے۔''

''مغیرہ!'' خالد عبداللہ قسریٰ نے اسے مخاطب کر کے پوچھا:

''تو اَب تم مجھے یہ بتاؤ کہ کیا مجھے ایسی خبر سے پریشان نہیں ہونا چاہیے؟''

مغیرہ نے جواب دیا:

''حضور! جب تک آپ کو یہ علم نہ ہو کہ یہ خبر پھیلانے والا کون ہے اس وقت تک آپ احتیاط فرمائیں۔ آپ کی حفاظت کرنے والے محافظوں میں، میں بھی شامل ہوں گا اور ہر وقت آپ کے ساتھ ہی رہوں گا۔ اگر کوئی آپ پر حملہ کرے گا تو ہم آپ کے لیے ڈھال بن جائیں گے۔''

خالد عبداللہ قسریٰ نے اس کی بات سن کر کہا:

''ٹھیک ہے، مگر تم لوگ کب تک میری حفاظت کرتے رہو گے؟''

مغیرہ بن سعید عجلی چاپلوسی کرتے ہوئے کہنے لگا:

''ہم آپ کی حفاظت کرتے ہوئے اپنی جان تک دے دیں گے۔''

غرض اس نے خالد عبداللہ قسریٰ کو مکمل طور پر مطمئن کیا کہ وہ اور اُس کے ساتھی اس کی ہر وقت حفاظت کریں گے اور اُس کے لیے ڈھال کا کام کریں گے۔

چناں چہ اس کے بعد گورنر خالد کہیں بھی آتے جاتے ان کے ساتھ مغیرہ بن سعید عجلی اور اُس کے ساتھی موجود رہتے۔ آہستہ آہستہ دن گزرتے گئے اور گورنر خالد قسریٰ کے قتل کی باتیں پُرانی ہونے لگیں اور لوگ بھی سمجھ گئے کہ کسی نے یہ افواہ ہی پھیلائی تھی۔

مغیرہ بن سعید عجلی بھی یہ بات جلد ہی سمجھ گیا کہ لوگ گورنر کے قتل کی باتوں کو اَفواہ سمجھ رہے ہیں اور اُس کی آزادی کا معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا ہے، لہٰذا اُس کے دماغ میں نئے نئے منصوبے پکنے لگے۔ ابھی مغیرہ بن سعید عجلی کوئی ترکیب نہیں سوچ پایا تھا کہ ایک روز گورنر خالد عبداللہ قسریٰ پر سچ مچ کا حملہ ہو گیا۔

ہوا کچھ یوں کہ گورنر خالد عبداللہ قسریٰ اپنے محافظوں کے ساتھ ایک فوجی چھاؤنی میں فوجی افسروں سے ایک خاص ملاقات کے لیے جا رہے تھے۔ چھاؤنی کے پاس ہی تین آدمی انھیں دیکھ کر اُن کی طرف بڑھنے لگے۔ وہ تینوں یوں آ رہے تھے جیسے وہ کوئی پریشان حال ہوں اور گورنر سے ملاقات کر کے اپنی پریشانی حل کروانا چاہتے ہوں۔

ابھی وہ خالد قسریٰ کے پاس آ ہی رہے تھے کہ مغیرہ بن سعید عجلی نے انھیں روک لیا اور پوچھا:

''تم کون ہو؟ اور گورنر سے کیوں ملاقات کرنا چاہتے ہو؟''

ان میں جو شخص سب سے آگے تھا اس نے مغیرہ بن سعید عجلی سے بدتمیزی سے کہا:

''تم تو ایک معمولی سے غلام ہو۔ میں تم سے کیوں بات کروں؟''

مغیرہ بن سعید عجلی نے اب اسے سختی سے روکا اور پوچھا:

''مجھے بتاؤ تم کون ہو اور گورنر سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟''

اس شخص نے اپنی کمر سے خنجر نکال کر مغیرہ بن سعید عجلی کو ڈرانا شروع کر دیا:

''میرے راستے سے ہٹ جاؤ، ورنہ میں تمھیں قتل کر دوں گا۔''

خنجر دیکھتے ہی وہاں موجود لوگ سمجھ گئے کہ یہ لوگ گورنر کو قتل کرنے آئے ہیں۔ مغیرہ بن سعید عجلی نے پھرتی سے اس شخص کا خنجر والا ہاتھ پکڑ لیا، اتنے میں محافظ بھی وہاں پہنچ گئے اور اُس شخص کو قابو کر لیا۔

اپنے ساتھی کو قابو میں آتا دیکھ کر باقی دونوں نے اپنے خنجر نکالے اور گورنر کی طرف بڑھنے لگے۔ محافظوں کی توجہ اس قابو کیے جانے والے شخص کی طرف تھی۔ گورنر نے اپنی طرف دو آدمیوں کو خنجر لے کر آتے دیکھا تو مغیرہ بن سعید عجلی کو آواز دی:

''مغیرہ! ان دونوں کو بھی سنبھالو۔''

مغیرہ نے دیکھا اور تلوار نکال کر اُن دونوں کی طرف بڑھا۔ ان میں سے ایک آدمی کی پوری توجہ گورنر کی طرف تھی، اس لیے مغیرہ نے اسی آدمی پر وار کیا اور اُسے قتل کر دیا۔ اپنے ساتھی کو قتل ہوتا دیکھ کر تیسرے آدمی کی توجہ مغیرہ کی طرف ہو گئی اور اِس موقع سے فائدہ اٹھا کر گورنر خالد عبداللہ قسریٰ نے اس شخص کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد خالد عبداللہ قسریٰ چھاؤنی میں چلے گئے اور جاتے ہوئے اس قابو آئے ہوئے شخص کے متعلق حکم دیا:

''اس شخص کو میرے سامنے پیش کرو۔''

محافظوں نے حکم کی تعمیل کی اور گرفتار ہونے والے شخص کو گورنر کی خدمت میں پیش کر دیا۔ گورنر نے اس سے سوال کیا:

''تم مجھے کیوں قتل کرنا چاہتے ہو؟''

وہ قیدی بہت ہی دکھ بھرے لہجے میں کہنے لگا:

''جناب عالی! ہم آپ کو قتل کرنے کے لیے نہیں، بل کہ آپ سے ملاقات کے لیے آئے تھے۔''

گورنر نے اس قیدی کا جواب سن کر پوچھا:

''تم کس سلسلے میں مجھ سے ملنا چاہتے تھے؟''

قیدی نے نہایت ہی دردمندانہ لہجے میں کہا:

''جناب عالی! ہمارے والد محترم چند برس پہلے خراسان کی ایک جنگ میں لشکر کے ساتھ گئے تھے، پھر اُس کے بعد اُن کی کوئی خبر نہیں آئی۔ ہم نے آپ سے ملنے کی کوشش کی تو ہمیں آپ سے ملنے بھی نہیں دیا گیا۔ آج ہمیں خبر ملی کہ آپ فوجی چھاؤنی میں تشریف لائیں گے تو ہم لوگ یہاں آ گئے۔ ان لوگوں نے یہاں میرے دونوں بھائیوں کو قتل کر دیا۔ اب مجھے ڈر ہے کہ کہیں یہ لوگ مجھے بھی قتل نہ کر دیں۔''

گورنر خالد عبداللہ قسریٰ ایک نرم دل اور خدا ترس انسان تھے۔ انھوں نے جب قیدی کی دکھ بھری کہانی سنی تو اُن کا دل بھر آیا۔ انھوں نے اس قیدی کی غم گساری کرتے ہوئے کہا:

''میں جلد ہی تمھارے والد کو تلاش کرواتا ہوں، تم بے فکر ہو جاؤ۔''

مغیرہ بن سعید عجلی ایک چاپلوس شخص تھا، اس لیے فوراً سمجھ گیا کہ قیدی چاپلوسی کر رہا ہے۔ اس نے اپنے مالک سے کہا:

''آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟ یہ شخص بالکل جھوٹا ہے۔ آپ اس کی بات پر ذرا غور فرمائیں تو آپ کو بھی یہ جھوٹا ہی لگے گا۔''

گورنر خالد قسریٰ نے مغیرہ کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے حکم دیا:

''اس قیدی کو احتیاط سے قید خانے میں رکھا جائے اور اس کے بیان کی تصدیق کے لیے اس کے والد کو تلاش کیا جائے۔''

یہ حکم دینے کے بعد گورنر خالد قسریٰ اپنی رہائش گاہ کی طرف چلے گئے۔ ادھر مغیرہ کھڑا منہ دیکھتا رہ گیا۔ اس کا تو خیال تھا کہ اس کے مالک اس موقع پر خوش ہو کر دیگر اُمرا اور رئیسوں کی طرح اسے شاباش دیں گے اور اُس کی کوئی خواہش پوچھیں گے، جس پر وہ جواب دے گا کہ ''حضور والا! مجھے غلامی سے آزادی چاہیے۔''

مگر ایسا کچھ بھی نہ ہوا، کیوں کہ گورنر خالد قسریٰ دوسرے امرا کی طرح نہیں تھے، اس لیے انھوں نے دیگر اُمرا کی طرح یک طرفہ فیصلہ نہ کیا اور اُس قیدی کے والد کی تلاش کا حکم دے دیا۔ گورنر خالد عبداللہ قسریٰ کے حکم پر جلد ہی تحقیقات کی گئیں۔

ایک روز اِس معاملے کا تحقیقی افسر گورنر خالد عبداللہ قسریٰ سے ملنے کے لیے آیا۔ اس نے گورنر کو تحقیقات کی رپورٹ پیش:

''امیر حضرت! آپ کے حکم کے مطابق ہم نے تحقیقات کیں اور معلوم ہوا کہ اس شخص کے والد کبھی فوج میں بھرتی نہیں ہوئے، اس لیے انھیں خراسان کے لشکر کے ساتھ بھیجا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ اس کے باوجود ہم نے خراسان جانے والے لشکر سے پتا کروایا تو اُنھوں نے بھی اس بات کی نفی کی ہے کہ اس طرح کا کوئی بھی شخص ان کے ساتھ نہیں آیا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس شخص کا بیان جھوٹا ہے۔ وہ آپ کو قتل کرنے کے ارادے سے ہی آیا تھا، نہ کہ اپنے والد کے متعلق جاننے کے لیے۔''

تحقیقی افسر نے مزید کہا: ''اگر اُس روز مغیرہ پھرتی نہ دکھاتا تو شاید آپ آج یہاں موجود نہ ہوتے۔''

''ہمم..... ٹھیک ہے۔'' گورنر خالد نے کچھ سوچ کر کہا۔ ''تم اس قیدی کو خلیفہ کو قتل کرنے کی سازش کر کے ملک سے غداری کرنے کے جرم میں پھانسی دے دو۔''

''جی بہت بہتر امیر حضرت! آپ کے حکم کی تعمیل کی جائے گی۔'' تحقیقی افسر نے کہا اور وہاں سے اجازت لے کر چلا گیا۔

افسر کے جانے کے بعد گورنر خالد عبداللہ قسریٰ نے اپنے ایک غلام کو حکم دیا:

''مغیرہ کو میرے پاس بھیجو۔''

وہ غلام گیا اور مغیرہ کو گورنر کا پیغام پہنچایا:

''مغیرہ! تمھیں آقا بلا رہے ہیں۔''

مغیرہ فوراً ہی گورنر کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا:

''حضور! غلام حاضر ہے۔ آپ نے غلام کو یاد فرمایا تھا؟''

گورنر خالد عبداللہ قسریٰ نے کہا:

''ہاں، میں نے تمھیں بلوایا تھا۔ وہ دراصل بات یہ ہے کہ تمھیں وہ قیدی تو یاد ہی ہوگا جسے چھاؤنی میں گرفتار کیا گیا تھا۔''

''جی جی حضور! اسے میں کیسے بھول سکتا ہوں۔''

مغیرہ نے جواب دیا۔

گورنر خالد عبداللہ قسریٰ نے کہا:

''ابھی کچھ دیر پہلے میرے پاس اس کے بیان کی تصدیق کرنے والا افسر آیا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ اس کے والد کبھی فوج میں بھرتی نہیں ہوئے تھے۔''

یہ سنتے ہی مغیرہ کے دل میں لڈو پھوٹنے لگے کہ آخر اُس کی بات سچ ثابت ہو ہی گئی، اب اس کا مالک اسے انعام و اِکرام سے نوازے گا یا پھر اُس کی کوئی خواہش پوچھے گا اور وہ آزادی کی خواہش کرے گا۔

ادھر گورنر خالد عبداللہ قسریٰ مزید کہہ رہے تھے:

''اس کا مطلب ہے کہ وہ جھوٹا تھا اور مجھے قتل کرنے کے لیے آیا تھا۔ اگر تم اس دن پھرتی نہ دکھاتے تو میں بے موت مارا جاتا۔''

پھر گورنر خالد عبداللہ قسریٰ نے اس سے کہا:

''مغیرہ! تمھارا بہت بہت شکریہ کہ تم نے میری جان بچائی۔''

''یہ تو میرا فرض تھا۔''

مغیرہ نے جواب دیا۔

گورنر خالد نے اس کے علاوہ مغیرہ سے مزید کوئی بات نہیں کی اور اُسے کہا کہ وہ اب جا سکتا ہے۔ مغیرہ کے دل میں پھوٹتے لڈوؤں کی جگہ مایوسی نے لے لی، وہ بہت ہی زیادہ بددِل ہو گیا، اس کے تو تمام تر منصوبے ہی برباد ہو گئے تھے۔

.....(جاری ہے).....

شگوفے

قارئین

☆مسافر نے پلیٹ فارم پر پہنچ کر ریلوے کے ایک ملازم سے پوچھا:

''کیا میں راول پنڈی جانے والی گاڑی پکڑ سکتا ہوں۔''

''اس کا دارومدار تو اِس بات پر ہے کہ آپ کتنا تیز دوڑ سکتے ہیں، کیوں کہ گاڑی بیس منٹ پہلے جا چکی ہے۔'' ریلوے ملازم نے سادگی سے جواب دیا۔

(زمل بنت محمد یاسر۔کراچی)

☆یوسف (عمران سے):

''ڈاکو کی مونث بتاؤ؟''

عمران (جلدی سے):''ڈاکیا۔''

(محمد حمزہ۔کراچی)

☆ہر پانچ چھے میل بعد کار کا انجن گرم ہوجاتا، جسے ٹھنڈا کرنے کے لیے کار روک کر ریڈی ایٹر میں پانی ڈالنا پڑتا۔ پانچویں مرتبہ جب مالک نے پانی ڈالنے کے لیے کار روکی تو نوکر سے رہا نہ گیا، اس نے کہا:

''جناب! دو لاکھ کی گاڑی میں دو سو روپے کا کائل لگوا لیتے تو کیا ہرج تھا۔''

(حسنہ بنت محمد طیب۔کراچی)

☆ایک دوست (دوسرے سے):

''میرا بھائی اتنا بہادر ہے جتنا شیر، اتنے طاقت وَر ہے جتنا گینڈا، اتنا اونچا ہے جتنا زرافہ، اتنا تیز رفتار ہے جتنا چیتا، اُس کی نظر اِتنی تیز ہے جتنی عقاب کی اور وہ اتنا چالاک ہے جتنی لومڑی۔''

دوسرے دوست نے حیران ہوکر پوچھا:

''تمھارا بھائی کس چڑیا گھر میں ہے؟''

(مدحت بنت محمد جاوید شیخ۔حیدرآباد)

☆ایک بس کا کنڈیکٹر ہکلا تھا۔ بس میں ایک ہکلا مسافر بھی سفر کر رہا تھا۔ کنڈیکٹر نے اس سے کرایہ مانگا:

''کک کک کک..... کرایہ دیں۔''

مسافر:''کک کک..... کتنے پیسے؟''

مسافروں میں ایک پولیس والا بھی بیٹھا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور دونوں کی پٹائی کرنے لگا۔ ایک مسافر بولا:

''بھائی صاحب! یہ تو ہکلے ہیں۔ آپ کو کیا ہوا ہے؟''

پولیس والا بولا:

''ی.....ی..... یہ..... یہ دونوں مم..... میری نقل اتار رہے ہیں۔''

☆گاہک (قصائی سے):

''یار! جلدی کرو، میرا قیمہ بنادو۔''

قصائی:''بابو جی! پہلے چودھری صاحب کی بوٹی بنادوں، پھر آپ کا قیمہ بھی بنادوں گا۔''

(محمد نوید۔سانگھڑ)

☆ایک مال دار کنجوس شخص کا بیٹا امتحان میں فیل ہوگیا۔ کافی سوچ بچار کے بعد بیٹے نے باپ کو اِن الفاظ میں اس بات کی اطلاع دی:

''پیارے ابا جان! آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ اس سال آپ کو میری کتابوں پر رقم خرچ کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی، کیوں کہ میرے اساتذہ نے مجھے مزید ایک سال تک موجودہ کلاس میں ہی رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔''

(باقر علی۔لودھراں)

☆سلیم (امجد سے):

''تمھارے ابو کیا کام کرتے ہیں؟''

امجد:''وہ ایسی چیز بناتے ہیں جس سے دیوار کے آر پار دیکھا جاسکتا ہے۔''

سلیم (حیرت سے):''اچھا! اس چیز کا نام کیا ہے؟''

امجد (اطمینان سے):''کھڑکی۔''

(محمد عامر اعجاز۔کوہاٹ)

☆ایک کاہل شخص کے مکان میں آگ لگ گئی۔ آس پاس کے لوگ آگ بجھانے کے لیے دوڑے، لیکن وہ مزے سے بیٹھا رہا۔ اس سے ایک شخص نے پوچھا:

''تعجب ہے! تمھارے گھر میں آگ لگ گئی ہے اور تم اطمینان سے بیٹھے ہو۔''

کاہل آدمی نے جواب دیا:

''میں اطمینان سے کہاں بیٹھا ہوں، بل کہ میں تو بارش کی دعا کر رہا ہوں۔''

(فیض الہادی۔جہانگیرہ)

سمرقند سے طویل سفر طے کر کے آنے والا قاصد، سلطنت اسلامیہ کے حکمران سے ملنا چاہتا تھا۔ اس کے پاس ایک خط تھا، جس میں غیر مسلم پادری نے مسلمان سپہ سالار قتیبہ بن مسلم کی شکایت کی تھی۔

پادری نے لکھا تھا:

''ہم نے سنا تھا کہ مسلمان جنگ اور حملے سے پہلے قبولِ اسلام کی دعوت دیتے ہیں۔ اگر دعوت قبول نہ کی جائے تو جزیہ دینے کا مطالبہ کرتے ہیں اور اگر

کوئی ان دونوں شرائط کو قبول کرنے سے انکار کرے تو جنگ کے لیے تیار ہوتے ہیں، مگر ہمارے ساتھ ایسا نہیں کیا گیا اور اچانک حملہ کر کے ہم پر غلبہ حاصل کر لیا گیا ہے۔''

یہ خط سمرقند کے سب سے بڑے پادری نے اسلامی سلطنت کے فرماں روا حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے نام لکھا تھا۔

دمشق کے لوگوں سے بادشاہِ وقت کی قیام گاہ کا معلوم کرتے کرتے وہ قاصد ایک ایسے گھر جا پہنچا جو اِنتہائی معمولی اور خستہ حالت میں تھا۔ ایک شخص دیوار سے لگی سیڑھی پر چڑھ کر چھت کی لیپائی کر رہا تھا اور نیچے کھڑی ایک عورت گارا اُٹھا کر اُسے دے رہی تھی۔

وہ جس راستے سے آیا تھا واپس اُسی راستے سے اُن لوگوں کے پاس جا پہنچا جنھوں نے اُسے راستہ بتایا تھا۔

اُس نے لوگوں سے کہا:

''میں نے تم سے اسلامی سلطنت کے بادشاہ کا پتا پوچھا تھا، نہ کہ اس مفلوک الحال شخص کا جس کے گھر کی چھت بھی ٹوٹی ہوئی ہے۔''

لوگوں نے کہا:

''ہم نے تمھیں پتا ٹھیک ہی بتایا ہے۔ وہی حاکم وقت عمر بن عبدالعزیز کا گھر ہے۔''

قاصد پر مایوسی چھا گئی اور بے دلی سے دوبارہ اُسی گھر پر جا کر دستک

دی، جو شخص کچھ دیر پہلے تک لیپائی کر رہا تھا وہی اندر سے نمودار ہوا۔

قاصد نے اپنا تعارف کرایا اور وہ خط حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کو دے دیا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے خط پڑھ کر اُسی خط کی پشت پر لکھا:

''عمر بن عبدالعزیز کی طرف سے سمرقند میں تعینات اپنے عامل کے نام

'ایک قاضی کا تقرر کرو جو پادری کی شکایت سنے۔''

یہ لکھ کر مہر لگا کر خط واپس قاصد کو دے دیا۔

سمرقند لوٹ کر قاصد نے خط کا جواب اور ملاقات کا احوال جب پادری کو سُنایا تو پادری پر بھی مایوسی چھا گئی۔

اس نے سوچا:

کیا یہ وہ خط ہے جو مسلمانوں کے اس عظیم لشکر کو ہمارے شہر سے نکالے گا؟

اسے گویا یقین تھا کہ کاغذ کا یہ ٹکڑا اُنھیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکے گا۔

مگر کوئی اور راستہ بھی نہ تھا، چناں چہ خط لے کر ڈرتے ڈرتے امیر لشکر اور حاکم سمرقند، قتیبہ بن مسلم کے پاس پہنچا۔

قتیبہ نے خط پڑھتے ہی فوراً ایک قاضی کا تعین کر دیا جو اُن کے اپنے خلاف سمرقندیوں کی شکایت سن سکے۔

قاضی نے پادری سے پوچھا:

''کیا دعویٰ ہے تمھارا؟''

پادری نے کہا:

''قتیبہ نے بغیر کسی پیشگی اطلاع کے ہم پر حملہ کیا، نہ تو اِس نے ہمیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی تھی اور نہ ہی ہمیں کسی سوچ بچار کا موقع دیا تھا۔''

قاضی نے قتیبہ کو دیکھ کر پوچھا:

''کیا کہتے ہو تم اس دعوے کے جواب میں؟''

قتیبہ نے کہا:

''قاضی صاحب! جنگ تو ہوتی ہی فریب اور دھوکا ہے۔ سمرقند ایک عظیم ملک ہے۔ اس کے قرب و جوار کے کمزور ملکوں نے نہ تو ہماری کسی دعوت کو مان کر اِسلام قبول کیا اور نہ ہی جزیہ دینے پر تیار ہوئے، بل کہ ہمارے مقابلے میں جنگ کو ترجیح دی۔ سمرقند کی زمینیں تو اور بھی سرسبز و شاداب ہیں۔ ہمیں پورا یقین تھا کہ یہ لوگ بھی لڑنے کو ہی ترجیح دیں گے، لہٰذا ہم نے موقع سے فائدہ اُٹھایا اور سمرقند پر قبضہ کر لیا۔''

قاضی نے قتیبہ کی بات کو نظر اَنداز کرتے ہوئے دوبارہ پوچھا:

''قتیبہ! میری بات کا جواب دو، تم نے ان لوگوں کو اِسلام قبول کرنے کی دعوت، جزیہ یا پھر جنگ کی خبر دی تھی؟''

قتیبہ نے کہا:

''نہیں قاضی صاحب! میں نے جس طرح پہلے ہی عرض کر دیا ہے کہ ہم نے موقع سے فائدہ اُٹھایا ہے۔''

قاضی نے کہا:

''میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اپنی غلطی کا اقرار کر رہے ہو، اس کے بعد تو عدالت کا کوئی اور کام رہ ہی نہیں جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس دین کو فتح اور عظمت تو دِی ہی عدل و انصاف کی وجہ سے ہے، نہ کہ دھوکا دہی اور موقع پرستی سے۔

میری عدالت یہ فیصلہ سناتی ہے کہ تمام مسلمان فوجی اور اُن کے عہدے داران، مع اپنے بیوی بچوں کے، اپنی ہر قسم کی املاک اور مالِ غنیمت چھوڑ کر سمرقند کی حدود سے باہر نکل جائیں اور سمرقند میں کوئی مسلمان باقی نہ رہنے پائے۔

اگر یہاں دوبارہ آنا بھی ہو تو بغیر کسی پیشگی اطلاع اور دعوت کے اور تین دن کی سوچ بچار کی مہلت دیے بغیر نہ آیا جائے۔''

پادری جو کچھ دیکھ اور سن رہا تھا وہ ناقابل یقین تھا۔ چند گھنٹوں کے اندر ہی اندر مسلمانوں کا عظیم لشکر قافلہ در قافلہ شہر چھوڑ چکا تھا۔

سمرقندیوں نے اپنی تاریخ میں ایسا کبھی نہیں دیکھا تھا کہ جب طاقت ور فاتح قوم، کمزور مفتوح قوم کو یوں دوبارہ آزادی بخش دے۔

ڈھلتے سورج کی روشنی میں لوگ ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرنے لگے کہ یہ کیسا مذہب ہے اور یہ کیسے پیروکار ہیں۔ عدل کا یہ معیار کہ اپنوں کے خلاف ہی فیصلہ دے دیں اور طاقت ور سپہ سالار اُس فیصلے پر سر جھکا کر عمل بھی کر دے۔

تاریخ گواہ ہے کہ تھوڑی ہی دیر میں پادری کی قیادت میں تمام شہر کے لوگ گھروں سے نکل کر لشکر کے پیچھے سرحدوں کی طرف دوڑے اور لا الہ الّا اللہ محمد رسول اللہ کا اقرار کرتے ہوئے اُنھیں واپس لے آئے کہ یہ آپ کی سلطنت ہے اور ہم آپ کی رعایا بن کر رہنا اپنے لیے فخر سمجھیں گے۔

دین رحمت نے وہاں ایسے نقوش چھوڑے کہ سمرقند ایک عرصے تک مسلمانوں کا دارالخلافہ بنا رہا۔

کبھی رہبر دو عالم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ایسی ہوا کرتی تھی۔

(ماخذ مسلمان سلاطین)

الائچی

سعد علی چھیپا۔ کراچی

چھوٹی الائچی یا سبز الائچی گھروں میں عام استعمال کی جاتی ہے اور یہ دنیا کے تقریباً تمام ممالک میں پائی جاتی ہے۔ اس کے استعمال سے صحت پر بے شمار فوائد مرتب ہوتے ہیں۔

الائچی دو طرح کی ہوتی ہے، چھوٹی یا سبز الائچی اور بڑی الائچی جسے کالی الائچی بھی کہتے ہیں۔

سبز یا ہری الائچی کے باقاعدگی سے استعمال کے آپ کی صحت پر بہت ہی زبردست اثرات مرتب ہوتے ہیں، جو نہ صرف آپ کا وزن کم کرنے میں مدد دیتے ہیں، بل کہ پیٹ کے درد، گیس، ہاضمے کے مسائل، جیسے تیزابیت، ڈایئریا، وغیرہ میں بھی بے حد مفید ہے۔

چھوٹی الائچی کے فوائد:

چھوٹی الائچی کا استعمال اگر باقاعدگی سے کیا جائے تو اِس سے وزن میں کمی آتی ہے۔

سبز الائچی کے بنیادی اجزا میں آئرن، کاپر اور وٹامن۔سی کے علاوہ ایسے وٹامنز موجود ہوتے ہیں جو خون کے سرخ خلیات کی افزائش کے لیے بے حد مددگار ثابت ہوتے ہیں اور اِنیمیا کی بیماری کا دیسی علاج ثابت ہوتے ہیں۔

سبز الائچی کو کے الیکٹرولائٹس کے لیے خزانہ قرار دیا جاتا ہے۔ یہ خون کی ترسیل کے عمل کو بہتر بناتی ہے اور بلڈ پریشر کو کنٹرول میں رکھنے میں مدد فراہم کرتی ہے۔

سبز الائچی السر کی بیش تر اَقسام میں بھی فائدہ مند ہے۔

سبز الائچی اپنے ڈی ٹاکسِن کے عمل سے جسم کے زہریلے اور فاسد مادوں کو ختم کرتی ہے۔

سبز الائچی کا باقاعدہ استعمال کینسر کے علاج میں بھی مددگار ثابت ہوتا ہے۔

سبز الائچی کو چبانے سے منہ میں بننے والے لعاب میں بھی اضافہ ہوتا ہے جو خوراک کو ہضم کرنے میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔

سبز الائچی اینٹی بیکٹیریل خصوصیات کی حامل ہے۔ اس کی تیز خوش بو منہ کی بدبو کو دُور کر دیتی ہے۔

سبز الائچی کا استعمال آنتوں کی سوزش میں انتہائی مفید ہے، جب کہ سینے کی جلن، متلی کی صورت میں بھی یہ اکسیر کا درجہ رکھتی ہے۔

سبز الائچی دل اور جگر کے لیے بھی ایک ٹانک کا کام دیتی ہے اور شوگر، یعنی ذیابیطس اور خون میں چکنائی کو کم کرنے میں بھی مددگار ہے۔

سبز الائچی کو اِستعمال کرنے کے دو طریقے ہیں۔ پہلا طریقہ تو یہ ہے کہ آپ الائچی کو اپنی روزمرہ خوراک کا حصہ بنالیں، یعنی جو بھی کھانا آپ کھائیں یا جب بھی چائے پییں، اس میں الائچی کو شامل کریں۔

دوسرا طریقہ جو زیادہ بہتر اور آزمودہ ہے، وہ یہ کہ آپ اسے ثابت حالت میں یا پیسے ہوئے پاؤڈر کے طور پر اِستعمال کریں۔

تمام قارئین کرام سے مؤدبانہ عرض ہے کہ کسی بھی سبزی کے فوائد پڑھ کر اسے زیادہ نہ کھائیں، بل کہ اس کا استعمال اعتدال سے کریں اور اگر آپ کو کوئی خاص بیماری ہے تو اپنے ڈاکٹر سے مشورہ کرکے کوئی بھی غذا استعمال کریں۔

خوں ریز نصیحت

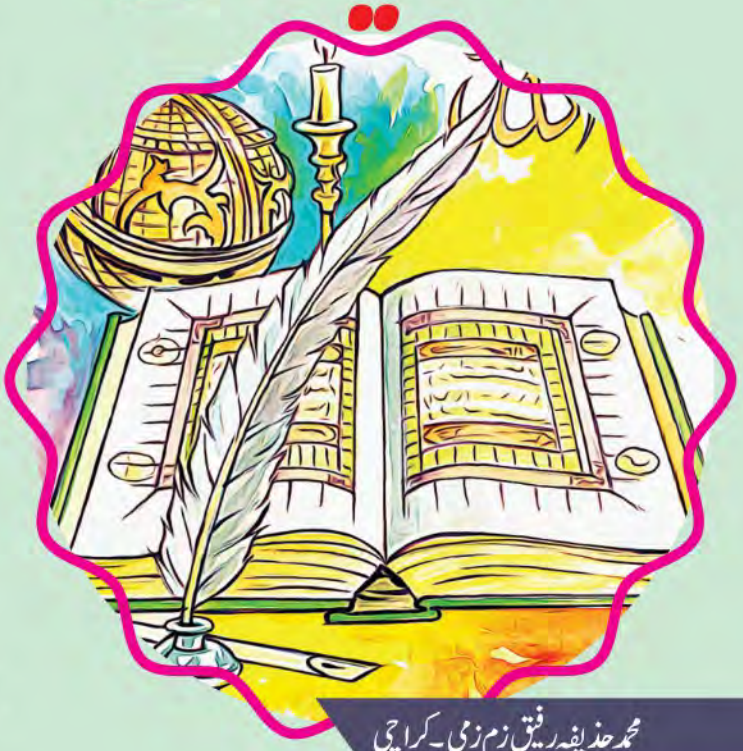

محمد حذیفہ رفیق زم زمی۔ کراچی

قَدْ قَامَتِ الصَّلَاۃ، قَدْ قَامَتِ الصَّلَاۃ!

مسجد نبوی میں اقامت کہی جارہی تھی اور لوگوں کی صفیں در صفیں بنتی چلی جارہی تھیں۔ آج مسجد نبوی میں معمول سے کہیں زیادہ ہجوم تھا۔ حج کے ایام بالکل قریب تھے۔ جتنے بھی لوگ حج کا ارادہ رکھتے تھے وہ آج یا کل مدینہ منورہ سے روانہ ہونے والے تھے۔

کندھے سے کندھا ملا کر نمازی کھڑے ہوتے چلے جارہے تھے۔ پہلی صف میں جہاں امت کے اور دوسرے بزرگ، اولیا، صلحا اور علما کھڑے تھے وہیں ایک عظیم تابعی بھی کھڑے اقامت سن رہے تھے، جن کی چالیس برس سے کبھی جماعت کی نماز نہیں چھوٹی تھی اور پورا مدینہ جانتا تھا کہ تیس سالوں میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مؤذن نے اذان کہی ہو اور وہ مسجد میں نہ ہوں۔ یہ کثرت سے روزے رکھنے والے بھی تھے۔ (سیر أعلام النبلاء: 221/4، ط: الرسالة)

یہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے داماد اور تابعین کے امام تھے۔ ان کا نام ہے: سعید بن مسیب (رحمۃ اللہ علیہ)۔

اقامت کے دوران میں ایک آدمی کو لوگ اگلی صفوں میں جگہ دینے لگے۔ وہ جس صف میں پہنچتا ہر اگلی صف کا ایک آدمی اس کے لیے اپنی جگہ چھوڑ کر پیچھے آجاتا۔ وہ اپنی ہیئت اور چال ڈھال سے کوئی عسکری کمانڈر معلوم ہو رہا تھا۔ یوں ہوتے ہوتے وہ بالکل پہلی صف میں جا کر کھڑا ہو گیا اور اتفاق سے بالکل سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ کے برابر میں کھڑا ہو گیا۔

یہ کون تھا بھلا!؟ یہ طائف کے ایک قبیلے بنو ثقیف کا ایک جوان اور بنو اُمیہ کا ایک اہم کمانڈر تھا۔ زمانہ اسے حجاج بن یوسف ثقفی کے نام سے جانتا ہے! ۷۲ھ میں وہ ایک کمانڈر کی حیثیت سے مدینہ منورہ آیا تھا۔

امام صاحب نے تکبیر کہی: اَللّٰہُ اَکْبَر اور نماز شروع ہو گئی۔ پوری مسجد میں وقار اور ہیبت کے ساتھ سکوت چھا گیا۔ اس کے بعد امام صاحب نے قراءت شروع کی، جس سے پوری مسجد گونجنے لگی۔ قراءت ختم کر کے امام صاحب رکوع میں چلے گئے اور حسبِ دستور نماز مکمل ہو گئی، لیکن نماز کے دوران میں سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے پڑوسی نمازی کی ایک ادا بہت زیادہ کھٹکتی رہی۔

پوری نماز میں حجاج بن یوسف امام سے پہلے ہی رکوع سے کھڑا ہو جاتا اور امام کے سجدے میں جانے سے پہلے ہی سجدے میں چلا جاتا۔

نماز سے فارغ ہوتے ہی حجاج بن یوسف جانے کے لیے اٹھنے لگا۔ سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا دامن پکڑ کر اُسے جانے سے روک لیا اور ساتھ ہی وہ اپنے اذکار میں مشغول رہے۔ حجاج نے اپنا دامن چھڑانے کی کوشش کی، لیکن سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ نے زور سے اسے جھٹکا دیا، جس کا مطلب یہ تھا کہ جب تک میرا ذِکر کا معمول پورا نہیں ہو جاتا اس وقت میں کچھ نہیں کہوں گا اور تم بھی اس وقت تک یہاں سے نہیں جاؤ گے، اور وہ زبانِ حال سے یہ کہہ رہا تھا کہ آپ کو اگر کچھ کہنا ہے تو کہیے، مجھے یوں باندھ کر کیوں رکھ دیا ہے؟ نہ بات کرتے ہو، نہ جانے دیتے ہو۔ جانتے نہیں ہو میں کون ہے؟

پچھلی صفوں کے نمازی کافی پریشان تھے اور عجیب عجیب نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے کہہ رہے ہوں کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ کہیں یہ چھوٹی سی حرکت مدینہ منورہ والوں کے لیے کسی مصیبت کا پیش خیمہ نہ بن جائے۔ حجاج زمانے کا مشہور و معروف ظالم کمانڈر رہے۔

خود حجاج غصے اور پریشانی کے ملے جلے جذبات میں تھا۔ آج تک کسی نے ایسی ہمت نہیں کی تھی۔ شاید کوئی اور ہوتا تو حجاج اسے سزا دے چکا ہوتا، لیکن یہ سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ تھے، اس لیے وہ بھی کسی قدر مرعوب تھا۔ چھڑانے کی کوشش تو کر رہا تھا، لیکن سعید بن مسیب کے ہاتھ کی گرفت بہت

مضبوط تھی اور اُس سے زیادہ مضبوط ان کے ایمان کی گرفت تھی، جس کے اثر سے حجاج بھی یہاں قدرے لاچار تھا اور اُس کی طاقت بے اثر تھی۔

بالآخر کچھ دیر بعد یہ کش مکش ختم ہوئی، سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ حجاج کی طرف متوجہ ہوئے اور اِنتہائی سخت اور تلخ لہجے میں فرمانے لگے:

یا سارق، یا خائن، تصلی هذه الصلاة؟

(او چور! او خیانت کرنے والے! یہ تُو نے کیسی نماز پڑھی ہے؟)

سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ کا اشارہ ایک حدیث کی طرف تھا، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: ''سب سے بُری چوری نماز کی چوری ہے۔'' پوچھا گیا: ''یارسول اللہ! نماز میں کوئی کیسے چوری کرے گا؟'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''رکوع اور سجدہ پورا نہ کرے۔''

(موطا امام مالک: 2/233، رقم: 177)

فوالله لقد هممت أن أضرب بهذا النعل وجهك۔

(اللہ کی قسم! میرا دل چاہ رہا ہے کہ یہ جوتے تمھارے چہرے پر ماروں۔)''

جہاں تک آواز گئی وہاں تک لوگوں کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ہر ایک سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ کے یہ الفاظ سُن کر بوکھلا گیا۔ ہر ایک کو تقریباً یقین تھا کہ یہ ایک خوں ریز نصیحت ہے، جو صرف سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ کو ہی نہیں، بل کہ اور بھی سینکڑوں لوگوں کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔

بہر کیف! سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی بات مکمل کر کے حجاج کا دامن چھوڑ دیا۔ حجاج پریشان کن نظروں سے سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف دیکھتا ہوا کھڑا رہا اور پھر باہر نکل گیا۔

اس کے بعد حجاج اپنے قافلے کے ساتھ مکہ مکرمہ روانہ ہو گیا اور حج کے بعد شام چلا گیا۔ لوگوں کے دل و دماغ پر یہ گفتگو نقش ہو گئی تھی۔ چند روز تک حلقوں اور مجمعوں میں یہ ماجرا گردش کرتا رہا۔ اس کے بعد بات دب گئی، قصہ پرانا ہو گیا۔

اگلے سال ۷۳ھ میں عبدالملک بن مروان نے حجاج کو حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے جنگ کے لیے مکہ مکرمہ بھیجا، جس کے نتیجے میں وہ دردناک اور خوں ریز معرکہ وجود میں آیا، جس کی انتہا حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی شہادت پر ہوئی۔ اس کے بعد عبدالملک بن مروان کے حکم سے حجاج بن یوسف نے مدینہ منورہ کا رُخ کیا اور اُسے عبدالملک بن مروان نے مدینہ منورہ کا گورنر تعینات کر دیا۔

یہاں مسجد نبوی میں سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ کا حلقہ لگا ہوا تھا۔

کئی گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دینے لگی جو مسجد نبوی کے دروازے پر آ کر رُکی، تلواروں کی جھنکار نے ہر ایک کو چونکا دیا۔ صدا لگانے والے نے مدینہ منورہ کے نئے گورنر کی آمد کی اطلاع دی۔ لشکر کے سپاہی مسجد کے اطراف میں پھیل گئے۔ مدینہ منورہ کا نیا گورنر، فاتح لشکر کا کمانڈر حجاج بن یوسف سرکاری دبدبے کے ساتھ اور مسلح سپاہیوں کے ہم راہ تلوار لٹکائے مسجد نبوی کے مرکزی دروازے سے نمودار ہوا۔

ہر ایک کی نظر حجاج کے خوف ناک چہرے اور اُس کی قبا سے لٹکتی تلوار پر پڑی، جو ابھی قریب ہی میں ایک عظیم شخصیت صحابیِ رسول حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے خون سے رنگین ہوئی تھی۔

یہ وہی حجاج بن یوسف ہے جس کے ظلم و ستم کی داستانوں کا چرچا سارے عالم اسلام میں تھا۔ اس کا نام جاننے والا ہر شخص یہ جانتا تھا کہ اسے خون بہانا اس قدر محبوب ہے جیسے بچوں کو کھیل محبوب ہوتا ہے۔ تاریخ میں جہاں اس کی اسلام کی سربلندی کی خدمات درج ہیں وہیں اسے بے شمار علما اور صلحا کا قاتل بھی لکھا گیا ہے، جن میں کئی صحابہ اور اکابر تابعین رضی اللہ عنہم بھی شامل ہیں۔

حجاج متکبرانہ اور فاتحانہ چال کے ساتھ آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ لوگ خوف اور ہیبت سے راستہ چھوڑتے جا رہے تھے۔ پورے مجمع پر سناٹا طاری تھا، ہر ایک کی نظر میں چند مہینے قبل سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ کا حجاج کو ڈانٹنے کا منظر تھا۔ دوسری طرف سعید بن مسیب کے چہرے پر اطمینان بھری مسکراہٹ تھی اور اُن کا وجود بالکل پُرسکون تھا۔

حجاج قریب آتا چلا گیا، یہاں تک کہ سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ کے بالکل سامنے پہنچ گیا۔ سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ اپنی مسند پر بیٹھے رہے۔ وہ ان کے سامنے پہنچ کر ایک لمحے کے لیے رُکا اور پھر نیچے بیٹھ گیا۔ اس نے پوچھا: ''وہ بات کہنے والے آپ ہی ہیں؟''

سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ ذرا آگے بڑھے اور پھر زور سے اپنا ہاتھ حجاج کے سینے پر مار کر کہا:

''ہاں، میں وہی ہوں۔''

حجاج نے سر جھکا لیا اور کہنے لگا:

جزاك الله من مُعلِّم ومُؤدِّب خيرًا

(اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آپ نے مجھے بہت خوب تعلیم دی اور مجھے باادب بنایا۔)

ما صلّيتُ بعدَكَ صلاةً إلا وأنا أذكرُ قولَك۔

(آپ کے ان جملوں کے بعد سے مجھے ہر نماز میں آپ کی نصیحت یاد رہی۔)

یہ کہہ کر حجاج اٹھ کر چل دیا اور لوگ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دونوں کو دیکھتے رہ گئے۔ دوسری طرف سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ کا درس اسی آن بان سے دوبارہ جاری ہو چکا تھا۔

ہمارے استاد

کتنی محنت سے پڑھاتے ہیں ہمارے استاد
ہم کو ہر علم سکھاتے ہیں ہمارے استاد

توڑ دیتے ہیں جہالت کے اندھیروں کا طلسم
علم کی شمع جلاتے ہیں ہمارے استاد

منزلِ علم کے ہم لوگ مسافر ہیں مگر
راستہ ہم کو دکھاتے ہیں ہمارے استاد

زندگی نام ہے کانٹوں کے سفر کا لیکن
راہ میں پھول بچھاتے ہیں ہمارے استاد

دل میں ہر لمحہ ترقی کی دعا کرتے ہیں
ہم کو آگے ہی بڑھاتے ہیں ہمارے استاد

سب کو تہذیب و تمدن کا سبق دیتے ہیں
ہم کو انسان بناتے ہیں ہمارے استاد

ہم کو دیتے ہیں بہر لمحہ پیامِ تعلیم
اچھی باتیں ہی بتاتے ہیں ہمارے استاد

خود تو رہتے ہیں بہت تنگ و پریشان مگر
دولت علم لٹاتے ہیں ہمارے استاد

ہم پہ لازم ہے کہ ہم لوگ کریں ان کا ادب
کس محبت سے پڑھاتے ہیں ہمارے استاد

محمد حارث حقانی۔ کراچی

سلام پہنچے

قرۃ العین ہاشمی۔ لاہور

''جہاں سر جھکے وہ مقامِ خدا ہے
جہاں دل جھکے، وہ مقام مصطفیٰ ہے (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)''

ماشاءاللہ، سبحان اللہ! جیسی آوازوں سے کمرا گونج اٹھا۔

حامد چاچو نے بہت عقیدت و احترام کے ساتھ جب شعر سنایا تو پوری محفل کی زبان پر پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں درود شریف جاری ہوگیا۔ یہ ایک عام سی پورے خاندان کی دعوت تھی جو بڑے تایا ابو اکثر اپنے گھر میں کرتے تھے۔ انھیں سب بہن بھائیوں کو اپنے گھر بلانے کا بہت شوق تھا۔ خوشی کا کوئی موقع ہوتا یا عید کا تہوار، بڑے تایا ابو کے گھر دعوت ضرور ہوتی تھی۔ کچھ دن پہلے ان کی بڑی بیٹی سعدیہ میڈیکل کے داخلہ امتحان میں کام یاب ہوئی تھی، جس کی سب کو بہت خوشی ہوئی تھی۔ بڑے تایا ابو کو تو موقع چاہیے تھا، انھوں نے فوراً سب کو دعوت پر بلا لیا۔

خاندان کے چھوٹے بڑے جب ایک جگہ جمع ہوتے تو ایک خوش گوار ماحول بن جاتا۔ چھوٹے بچے کھیل کود میں مصروف ہوتے، بڑے بچے مستقبل کے منصوبے بناتے، جب کہ بڑے سیاست سے لے کر گھریلو مسائل، ہر طرح کے موضوع کو ضرور زیرِ بحث لاتے۔

حامد چاچو نے اپنے شوق اور لگن کی وجہ سے قرآن حفظ کیا۔ انھیں بہت سی احادیث بھی مستند حوالوں کے ساتھ یاد تھیں۔ انھیں کئی نعتیہ اشعار بھی زبانی یاد تھے۔ وہ کوشش کرتے تھے کہ آج کل کی نسل کو بھی قرآن اور حدیث کے حوالوں سے چھوٹی چھوٹی مثالیں دے کر سمجھا سکیں۔ بچے ان کی بات سنتے بھی تھے۔

ایک دن حامد چاچو بازار خریداری کرنے گئے۔ وہاں انھیں اچانک ان کا بچپن کا دوست نصیب مل گیا۔ نصیب انھیں دیکھتے ہی گلے لگ گیا۔

''کہاں ہوتے ہو یار!؟ کتنی مدت ہوگئی ملاقات ہوئے!''

نصیب نے کہا، پھر وہ دونوں قریبی ہوٹل میں چلے گئے، جہاں بیٹھ کر وہ آرام سے باتیں کر سکتے تھے۔ گفتگو بچپن سے شروع ہوئی اور حال پر آ کر رُک گئی۔

''مجھے افسوس ہے کہ تم آج بھی ترقی نہیں کر سکے۔'' نصیب نے منہ بنا کر کہا۔

''کیا مطلب!؟'' حامد نے حیرت سے سوال کیا۔

''یار! تم آج بھی کنویں کے مینڈک بنے ہوئے ہو۔ مجھے دیکھو، کتنی ترقی کر لی ہے۔ بہترین ملازمت ہے۔ اعلیٰ ''لائف اسٹائل'' ہے، مگر تم معمولی سے استاد ہو۔'' نصیب نے منہ بنا کر کہا تو حامد مسکرا دیا۔

''خیر، استاد کبھی معمولی نہیں ہوتا۔''

حامد نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا، مگر نصیب کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ حامد کا مذاق ہی اڑاتا رہا۔ حامد کے سادہ حلیے اور شلوار قمیص سے نصیب

یہ سمجھ رہا تھا کہ حامد گلی محلے کے کسی عام سے اسکول میں پڑھاتا ہوگا۔ حامد نے بھی اس بارے میں زیادہ بات نہیں کی، جس سے نصیب کو یقین ہوگیا کہ حامد اپنی معمولی نوکری کو چھپا رہا ہے۔

''اچھا سنو، اگلے ہفتے کچھ دوستوں کے ساتھ دعوت کا پروگرام ہے۔ کافی عرصہ ہوگیا ہے، ہم مل کر نہیں بیٹھے۔ تم بھی ضرور آنا۔''

جانے سے پہلے نصیب نے کہا تو حامد نے سر ہلا دیا۔ یہ چھوٹی سی دعوت نصیب نے اپنے گھر میں رکھی تھی۔

ہفتے والے دن سب دوست اکٹھے ہوئے۔ خوب ہنسی مذاق، کھانا پینا ہوا۔ سب بہت خوش تھے۔ ایک مدت کے بعد بچپن کے دوست ملے تھے۔ اچانک باتوں کا رُخ حامد کی طرف مڑ گیا۔ نصیب پھر اُس کا مذاق اڑانے لگا۔ سب اس کی باتوں پر ہنس رہے تھے۔ حامد چہرے پر مسکراہٹ سجائے خاموش اس کی باتیں سنتا رہا۔

''بابا!'' اچانک دروازہ کھلا اور نصیب کا نو سال کا بیٹا اندر داخل ہوا۔

''آجاؤ کاشان!''

نصیب نے مسکرا کر کہا۔ کاشان کے پیچھے پیچھے نصیب کے باقی دونوں بچے بھی وہاں آگئے۔ چھے سالہ فیضان اور سات سال کی ام ہانی۔ نصیب نے سب دوستوں سے تعارف کروایا۔ سب نے بچوں کو پیار کیا۔

''اگلی مرتبہ ہم اپنے گھر والوں کو بھی لے کر آئیں گے، تاکہ بچے ایک دوسرے سے دوستی کر سکیں۔'' ایک دوست نے کہا۔

''سر حامد!''

اچانک بچوں کی نظر بیت الخلاء سے ہاتھ دھو کر نکلتے حامد پر پڑی تو وہ مؤدب کھڑے ہوگئے۔ فیضان بھاگ کر سر حامد کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ حامد نے اسے گود میں اٹھالیا۔

''حامد کو کیسے جانتے ہو؟'' نصیب نے حیرانی سے اپنے بچوں کی طرف دیکھا۔

''یہ ہمیں ریاضی پڑھاتے ہیں۔'' کاشان نے کہا تو نصیب حیران رہ گیا۔

''حامد! کیا تم ان کے اسکول میں پڑھاتے ہو؟''

نصیب نے حیرت سے سوال کیا تو حامد نے مسکرا کر اِثبات میں سر ہلایا اور فیضان کو گود میں اٹھائے صوفے پر بیٹھ کر اپنے ساتھ بٹھالیا۔

''مگر یہ تو شہر کے مشہور اِنگلش میڈیم اسکول میں پڑھتے ہیں۔''

نصیب کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اپنی بات کیسے مکمل کرے۔

''ہاں تو! میں بھی شہر کے مشہور اِنگلش میڈیم اسکول میں بچوں کو ریاضی پڑھاتا ہوں، کیوں کہ میں نے ریاضی میں ٹاپ کیا ہے۔'' حامد نے کہا تو سب کے آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

''میں تو سمجھا تھا کہ تم کوئی عام سی نوکری کر رہے ہو۔'' نصیب نے شرمندگی سے کہا۔

''کس وجہ سے؟ کیا میری سادگی کو دیکھ کر؟'' حامد نے مسکرا کر پوچھا۔

''تم ہر بات میں دین کا حوالہ دیتے ہو تو مجھے لگا کہ شاید تم عام سے مولوی بن گئے ہو۔'' نصیب نے شرمندگی سے کہا۔

''الحمدللہ! میں حافظ قرآن ہوں اور اپنا ہر عمل اپنے دین کے مطابق کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ دراصل ہم لوگ آپ ﷺ کی سنت کے مطابق زندگی گزار کر ہی دنیا اور آخرت میں کامیاب ہو سکتے ہیں، کیوں کہ اسلام دین حق ہے۔ اسلام کبھی بھی ترقی کے خلاف نہیں ہے۔ ہمیں اس سوچ کو غلط ثابت کرنا ہے کہ دین کا علم رکھنے والے غیر ترقی یافتہ ہوتے ہیں۔ میں بچوں کو ریاضی پڑھاتا ہوں، مگر ساتھ ساتھ انھیں قرآن وحدیث کا علم سکھانے کی بھی کوشش کرتا ہوں۔''

حامد نے سنجیدگی سے کہا تو نصیب نے اٹھ کر اُسے گلے لگالیا۔

''میں اپنی غلط سوچ اور پچھلے رویے کی معافی مانگتا ہوں۔ دراصل میرے ذہن میں کچھ اور تصور تھا، مگر آج تم نے اسے غلط ثابت کر دیا۔

بے شک قرآن اور سنت رسول ﷺ پر عمل کرنے میں ہی ہمارے لیے خیر ہے اور ہماری اور ہماری نسلوں کی کامیابی کی ضمانت بھی۔''

نصیب نے کہا تو سب نے تائید کی۔

کچھ عرصے بعد حامد کو سعودی عرب کی ایک یونی ورسٹی نے اعزازی طور پر بلایا، کیوں کہ حامد نے سیرت النبی ﷺ پر بہترین مقالہ لکھا تھا، جس پر حامد کو اِنعامی رقم اور سند دی جارہی تھی۔

حامد چاچو اپنے گھر والوں کے ساتھ سعودی عرب چلے گئے۔ وہاں جاتے ہی انھوں نے سب سے پہلے عمرہ ادا کیا، پھر وہ روضہ رسول ﷺ پر گئے۔ مسجد نبی ﷺ میں قدم رکھتے ہی ان کا رواں رواں درود شریف پڑھنے لگا۔

بساطِ عالم کی وسعتوں سے ، جہاں بالا کی رفعتوں سے
ملک ملک کا درود اترے ، بشر بشر کا سلام پہنچے
میرا قلم بھی ہے ان کا صدقہ، میرے ہنر پہ ہے ان کی رحمت
حضور خواجہ کو مرے قلم کا، مرے ہنر کا سلام پہنچے

صلی اللہ علیہ وسلم

اب دیر نہیں کرنی چاہیے

فاتح کون ۲

۳

نذیر انبالوی۔ لاہور

کمرے میں پھیلی خوش بُو کو غصے نے بھی محسوس کیا تھا۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھا تو اُس کی نظر تحمل اور برداشت پر پڑی۔ غصہ اب جان گیا کہ کمرے میں خوش بُو کیوں پھیلی ہے۔

''اچھا تو تم آ گئے ہو!؟'' غصے نے تحمل اور برداشت، دونوں کو گھورا۔

''ہاں، ہم آ گئے ہیں۔ اب تمھاری رخصتی کا وقت ہے۔ اٹھو اور یہاں سے نکل جاؤ۔'' تحمل نے غصے کی طرف دیکھ کر کہا۔

''میں اور یہاں سے جاؤں، ایسا ممکن نہیں ہے۔ عادل میرے اشاروں پر چل رہا ہے، تمھاری یہاں دال نہیں گلے گی۔ جاؤ یہاں سے، وقت ضائع مت کرو۔''

غصے نے تحمل اور برداشت کو گھورا۔

عادل کی آنکھ کھلی تو اُس کے سامنے تحمل اور برداشت موجود تھے۔

ظفر مسلسل کچھ پڑھ رہا تھا۔

''ظفر کھڑے کیوں ہو، بیٹھ جاؤ، کھڑے کھڑے تھک جاؤ گے۔''

عادل کا لہجہ بہت نرم تھا۔ غصے کو یہ لہجہ اپنانے پر عادل پر غصہ آ رہا تھا۔

''یہ وہی ہے جس نے تمھارے دوستوں پر شربت گرایا تھا۔'' غصے نے ظفر کی طرف اشارہ کیا۔

''اس نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا تھا، اس کا پاؤں قالین میں اُلجھ گیا تھا۔ میں نے اس کے منہ پر تھپڑ مار کر بہت بُری حرکت کی تھی۔ ظفر مجھے معاف کردو۔''

عادل نے ظفر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''چھوٹے مالک! ایسا نہ کہیں، میں آپ سے ناراض نہیں ہوں، بس آپ جلدی سے ٹھیک ہو جائیں۔'' ظفر کی بات سن کر تحمل اور برداشت نے اُسے مخاطب کیا:

''عادل کو معاف کر دو۔''

''میں انھیں معاف کر چکا ہوں۔ انسان جب غصے میں ہوتا ہے تو ایسا کر گزرتا ہے، غصہ ہم سب کا دشمن ہے۔''

ظفر کا ایک ایک لفظ غصے پر ہتھوڑا بن کر برس رہا تھا۔ وہ غصے سے مزید لال پیلا ہوا جا رہا تھا۔ غصے نے منہ ہی منہ میں کہا:

''شرشر! حاضر ہو جاؤ، شیطان ابنِ شیطان! یہاں آؤ، مجھے تمھاری مدد کی ضرورت ہے۔''

کچھ دیر بعد کمرے میں بدبو نے بسیرا کر لیا۔ عادل نے شرشر کو دیکھ لیا۔

''جاؤ یہاں سے، میں تمھاری صورت نہیں دیکھنا چاہتا، نکل جاؤ میرے کمرے سے، جاؤ، جاؤ'' عادل، شرشر کو دیکھ کر چلّایا۔

شرشر نے غصے کی طرف دیکھا۔ غصے نے کونے میں کھڑے تحمل اور برداشت کی طرف اشارہ کیا۔ شرشر نے ان دونوں کو کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا:

''اچھا تو عادل اِن کی موجودگی کے باعث مجھے یہاں سے چلے جانے کے لیے کہہ رہا ہے۔ نیکی نگر سے انھیں ملکہ نیکی نے بھیجا ہوگا۔ اس بار

میں اکیلا، ہاں اکیلا، نیکی نگر کی اینٹ سے اینٹ بجاؤں گا۔‘‘

’’نیکی نگر کے باسی تم جیسوں کا مقابلہ کرنا خوب جانتے ہیں۔ پہلے یہاں تو مقابلہ کرلو، پھر نیکی نگر بھی آجانا۔‘‘ برداشت نے شرشر کی بات کا جواب دیا۔

’’یہاں تو مقابلہ ہم جیت چکے ہیں۔ عادل ہمارا دوست بن چکا ہے، یہ ہمارے ساتھ.....‘‘

غصے کی بات بھی ابھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ عادل نے کہا:

’’میں تمھارا دوست تھا، اب نہیں ہوں، مجھے تم سے اور شرشر سے شدید نفرت ہے، تم دونوں فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔‘‘

شرشر اور غصے نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اب ان کا وہاں ٹھہرنا بے کار تھا۔ تحمل اور برداشت نے آتے ہی عادل کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

شرشر اور غصہ جب کمرے سے باہر گئے تو بدبو بھی ساتھ ہی ختم ہوگئی۔

عادل نے ظفر کو اپنے قریب بٹھا لیا۔ تحمل اور برداشت بھی ان کے دائیں طرف موجود تھے۔

’’ایک بڑی دعوت ہوگی جس کے مہمانِ خصوصی تم ہوگے، یعنی ظفر صاحب۔‘‘

عادل کی بات سن کر ظفر نے کہا:

’’چھوٹے صاحب! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں!؟‘‘

’’اس دعوت کا سارا اِنتظام میں کروں گا۔‘‘ عادل بولا۔

کمرے سے باہر کھڑے شرشر اور غصے نے بھی اس دعوت کے بارے میں سن لیا۔ کچھ دیر بعد دونوں عادل کی امی جان کے سامنے کھڑے تھے۔

’’اچھا تو عادل، ظفر کے اعزاز میں دعوت کرنا چاہتا ہے، یہ تو بہت اچھی بات ہے، بے چارے کو یوں ہی تھپڑ پڑا تھا۔‘‘ امی جان نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

’’خاک اچھی بات ہے، پیسا ضائع ہوگا، ظفر کو اِتنی اہمیت دینا ٹھیک نہیں، آخر وہ نوکر ہے۔‘‘ غصے نے کہا۔

’’نوکر ہے تو کیا ہوا، آخر انسان ہے، جیتا جاگتا انسان! میں خود دعوت میں شرکت کروں گی۔‘‘

امی جان کا جواب سن کر شرشر اور غصے نے وہاں سے چلے جانے میں ہی عافیت جانی۔

عادل کے ابو سیٹھ اقبال باغیچے میں بیٹھے تھے۔ شرشر اور غصے نے انھیں ظفر کے اعزاز میں ہونے والی دعوت کی اطلاع دی۔

’’اس گھر میں اب ایسا بھی ہوگا، نوکروں کے اعزاز میں دعوت کا بندوبست کیا جائے گا۔ یہ عادل کی عقل کو کیا ہوگیا ہے!؟‘‘ سیٹھ اقبال حسین کا لہجہ تلخ تھا۔

’’بیگم.....بیگم!‘‘

’’جی.....جی.....فرمائیے۔‘‘ امی جان نے باغیچے میں آکر کہا۔

’’یہ میں کیا سن رہا ہوں؟ ظفر کے اعزاز میں دعوت دی جارہی ہے اور ہمیں اس کے بارے میں کچھ بتایا ہی نہیں گیا۔‘‘

’’مجھے بھی ابھی ابھی اس دعوت کے بارے میں معلوم ہوا ہے، آپ کو بھی اس دعوت میں شریک ہونا ہے۔‘‘

امی جان کی بات سن کر سیٹھ اقبال حسین ایک دم غصے میں آگئے:

’’ہم سیٹھ اقبال حسین، اب ایک نوکر کے اعزاز میں دی گئی دعوت میں شرکت کریں گے، ہم سے ایسا نہیں ہوگا۔‘‘

سیٹھ اقبال حسین کے جواب نے امی جان کو پریشان کر دیا، جب کہ شرشر اور غصے کو خوش کر دیا۔

وہ دونوں بہت خوش تھے۔ سیٹھ اقبال حسین پر دونوں کو اُس وقت بھی بہت پیار آیا تھا جب انھوں نے سر عبداللہ کو اِسکول سے نکلوانے میں بھرپور کردار اَدا کیا تھا۔

سر عبداللہ نے عادل کو اُس کی ایک سنگین غلطی پر تھپڑ مارا تھا، جس پر غصہ ہوکر سیٹھ اقبال نے انھیں عادل سے اسمبلی میں آکر معافی مانگنے کا کہا، لیکن سَر عبداللہ نے اسمبلی میں آکر معافی مانگنے سے انکار کر دیا تھا۔

اس دن سیٹھ اقبال حسین کا غصہ دیکھنے کے قابل تھا، جب کہ عادل نے سَر عبداللہ سے رابطہ کر کے نہ صرف معافی مانگی تھی، بل کہ اب ظفر کے اعزاز میں دی جانے والی دعوت میں بھی آنے کی دعوت دی تھی۔ اس دعوت کو سَر عبداللہ نے قبول کرلیا تھا۔

’’اچھا تو اَب عبداللہ یہاں آئے گا، یعنی میرے بنگلے میں۔‘‘

سیٹھ اقبال حسین کو اُس وقت غصے نے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔

’’بابا! غلطی میری تھی، سر عبداللہ کی نہیں تھی۔ سر عبداللہ بہت اچھے انسان اور بہت اچھے استاد ہیں۔‘‘ عادل نے جواب دیا۔

’’میں نے پہلے عبداللہ کو اِسکول سے رخصت کروایا تھا، میں اب ظفر کو اپنے بنگلے سے نکال دوں گا۔‘‘ سیٹھ اقبال حسین نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

’’بابا! آپ ایسا مت کیجیے۔ ظفر بہت اچھا ہے، میں اس کے اعزاز میں دعوت نہیں کروں گا، آپ اسے نوکری سے فارغ مت کیجیے۔‘‘

عادل نہیں چاہتا تھا کہ ظفر کو نوکری سے نکالا جائے۔

''ٹھیک ہے، دعوت کو ابھی منسوخ کر دو، میں ظفر کو نوکری سے فارغ نہیں کروں گا۔''

غصہ اور شرشر نے یہ بات سنی تو اُن کی نظر برداشت اور تحمل پر پڑی۔

''اب یہاں کیوں کھڑے ہو، جاؤ یہاں سے۔'' غصے نے دونوں کو گھورا۔

اسی شام سیٹھ اقبال حسین دفتر جانے کے لیے نکلے۔ ان کا ذاتی ڈرائیور طبیعت خراب ہونے کے باعث دو گھنٹے قبل چھٹی لے کر چلا گیا تھا۔ سیٹھ اقبال حسین اس وقت خود گاڑی چلا رہے تھے۔

جب وہ نہر کے پاس پہنچے تو وہ دائیں طرف جاتی ایک گاڑی سے ٹکرا گئے۔ غلطی ان کی اپنی تھی۔ وہ گاڑی سے اترے۔ دوسری گاڑی سے بھی ایک عمر رسیدہ شخص نکلا۔ سیٹھ اقبال حسین کو توقع تھی کہ دوسری گاڑی سے نکلنے والا شخص انھیں بُرا بھلا کہے گا، مگر ایسا ہوا نہیں، عمر رسیدہ شخص نے گاڑی سے نکلتے ہی ہاتھ ملایا۔

''وہ...... آپ...... میں......'' سیٹھ اقبال حسین اس صورتِ حال کے لیے قطعی طور پر تیار نہ تھے۔

''آپ سے گاڑی لگ گئی، کوئی بات نہیں! میں مرمت کروالوں گا۔''

''میں مرمت کے پیسے ادا کروں گا۔'' سیٹھ اقبال حسین نے کہا۔

''شکریہ، نقصان کچھ زیادہ نہیں ہے، میں خود مرمت کروالوں گا۔''

''آپ کا نام کیا ہے، آپ کرتے کیا ہیں؟ میں سیٹھ اقبال حسین ہوں۔''

''میں شاکر ہوں، ایک اسکول میں استاد ہوں۔ اچھا تو آپ سیٹھ اقبال حسین ہیں!'' شاکر نے حیرانی سے کہا۔

''کیا آپ مجھے جانتے ہیں؟''

''جی ہاں، سر عبداللہ نے آپ کے بیٹے عادل کو تھپڑ مارا تھا، کافی دنوں تک اس واقعے کی بازگشت سنائی دیتی رہی تھی۔''

شاکر نے سیٹھ اقبال حسین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''غلطی عبداللہ کی تھی۔''

''بالکل غلط! غلطی آپ کے بیٹے عادل کی تھی، لیکن بے چارے سر عبداللہ نوکری سے نکال دیے گئے۔ دو مہینے وہ بے روزگار رہے، پھر میں انھیں اپنے اسکول میں لے گیا۔ اب وہ میرے ساتھ ہی ہوتے ہیں۔''

شاکر کی باتیں سُن کر سیٹھ اقبال حسین کا سَر شرم سے جھک گیا۔ انھوں نے شرشر اور غصے سے دوستی کر کے اچھا نہیں کیا تھا۔

''کیا آپ میری سر عبداللہ سے ملاقات کروا سکتے ہیں؟''

''ہاں ہاں، کیوں نہیں، جب آپ حکم کریں میں آپ کی سر عبداللہ سے ملاقات کروادوں گا۔'' شاکر نے جواب دیا۔

''میں ابھی اور اِسی وقت سر عبداللہ سے ملنا چاہتا ہوں، اب دیر نہیں کرنی چاہیے۔'' یہ کہہ کر سیٹھ اقبال حسین اپنی گاڑی میں بیٹھ گئے۔

(سیٹھ اقبال حسین کی سر عبداللہ سے ملاقات ہوئی یا نہیں؟
یہ جاننے کے لیے پڑھیے اگلی قسط)

......(جاری ہے)......

خوش خبری

مقابلۂ خوش خطی ۱۴

طلباو طالبات کے لیے انعامات جیتنے کے مواقع

بارہ مہینے
بارہ انعامات

انعامات:

اول آنے پر 1000 روپے / دوم آنے پر 700 روپے

سوم آنے پر 500 روپے

مقابلے میں شریک ہونے کے لیے مندرجہ ذیل فن پارے کو لکھیے۔ جو قاری اس فن پارے کو عمدہ انداز میں لکھنے میں کام یاب ہوگیا، وہ انعام کا حق دار ہوگا۔

تو پھر دیر کس بات کی! اٹھایئے کاغذ اور قلم، کیجیے مشق.....اور ہمیں جلد از جلد اِرسال کر دیجیے۔

مقابلے سے متعلق ضروری ہدایات:

☆ کمپیوٹر پیپر (A-4 سائز) صفحہ استعمال کیجیے۔

☆ فن پارے کو لکھنے کے لیے فونٹین پین، پنسل، کٹا ہوا پین اور کٹا ہوا مارکر استعمال کر سکتے ہیں۔

☆ کالی اور نیلی روشنائی استعمال کیجیے، کوئی اور رنگ بالکل استعمال نہ کیجیے۔

☆ صفحے کے چاروں جانب سے تقریباً ایک ایک اِنچ کا فاصلہ رکھ کر نمونہ تحریر کیجیے۔

زیرِ انتظام
شعبہ خوش خطی، البدر ہائر سیکنڈری اسکول

اَلکریم

نوٹ: فن پارہ ۳۱، اکتوبر ۲۰۲۱ء تک ہمیں موصول ہوجانا چاہیے۔ ایک فن پارہ ایک طالب علم کی طرف سے قبول کیا جائے گا۔ کمیٹی کا فیصلہ حتمی ہوگا، جس پر اِعتراض قابل قبول نہیں ہوگا۔ مقررہ تاریخ کے بعد وصول ہونے والے فن پارے مقابلے میں شریک نہیں کیے جاسکیں گے۔

پیغامِ سیرت

سچوں کے امام

عبداللہ بن مسعود۔ کراچی

سچائی اور اَمانت داری کا دور آیا ہی چاہتا تھا، جھوٹ اور طرح طرح کی خرابیوں سے زمین بھر چکی تھی۔

پھر آخر وہ دن آ ہی گیا۔ سچوں کے امام حضرت محمد ﷺ اس دنیا میں تشریف لے آئے اور سچ کی خوش بو سے اس دنیا کو معطر کر دیا۔

پیارے بچو! اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو اِس دنیا میں لوگوں کو سیدھا راستہ، سچ کا راستہ اور کام یابی کا راستہ دکھانے کے لیے اپنا نائب اور نبی بنا کر بھیجا۔

رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے اپنے قریبی رشتے داروں کو اپنا پیغام سنانے کا حکم دیا، جس کے لیے سورۂ شعراء کی آیت نمبر ۲۱۴ نازل ہوئی۔

آپ ﷺ اپنے رب کے حکم کو بجالانے کے لیے فوراً تیار ہو گئے اور صفا پہاڑی پر کھڑے ہو کر لوگوں کو پکارنے لگے۔ قریش کے ایک ایک گروہ کو نام لے لے کر آپ ﷺ نے آواز دی۔ سب جمع ہو گئے تو رسول اللہ ﷺ نے اُن سے ایک بات پوچھی اور سوال کیا کہ کیا تم مجھے اس بات میں سچا سمجھو گے؟

سب نے یک زبان ہو کر ایک جملہ کہا:

''مَا جَرَّبْنَا عَلَيْكَ اِلَّا صِدْقًا (ہم نے تو ہمیشہ آپ کو سچا ہی پایا ہے۔)''

اس کے بعد آپ علیہ السلام نے انھیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرایا۔ لوگوں نے باوجود آپ کو سچا ماننے کے آپ کی مخالفت کی، ابولہب نے تو بُرا بھلا بھی کہا، جس پر سورۂ لہب نازل ہوئی۔

(صحیح بخاری: ۲۸۴۴)

عزیز بچو!

ہمارے آقا حضرت محمد ﷺ اتنے سچے انسان تھے کہ دشمن بھی آپ کی صداقت اور سچائی کی گواہی دیتے تھے۔ جھوٹ تو کبھی آپ ﷺ کی زبان پر آیا ہی نہیں۔ آپ ﷺ سچائی کے خوگر اور سچائی ہی کی دعوت دینے والے تھے۔

ابوجہل جو حضرت محمد ﷺ کا بہت خطرناک دشمن تھا، وہ بھی آپ علیہ السلام کی سچائی کو مانتا تھا اور آپ علیہ السلام کو بچپن سے ''اَلصَّادِقُ الْاَمِیْنُ (سچے اور امانت دار)'' کہہ کر پکارتا تھا۔

پیارے دوستو! آپ کو ایک بات اور بتاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم اور حضرت ادریس علیہما السلام کی سورۂ مریم میں ایک صفت بیان فرمائی ہے اور وہ ہے سچائی کی صفت۔ اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام جب قید خانے میں تھے، ان کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا۔ وہ شخص جب رہائی کے بعد دوبارہ حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس آیا تو اُس نے آپ کو یوں مخاطب کیا:

''یوسف! اے وہ شخص جس کی ہر بات سچی ہوتی ہے۔''

معلوم ہوا کہ ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دیگر تمام انبیائے کرام علیہم السلام ہمیشہ سچ ہی بولا کرتے تھے، سچ کے سوا اُن کی زبان سے کچھ نکلتا ہی نہیں تھا، حتیٰ کہ سچائی ان کی پہچان، اُن کا لقب اور اُن کا امتیازی وصف بن گیا تھا۔

پیارے ساتھیو!

ہماری یہ خوش قسمتی ہوگی کہ ہم بھی اپنے پیارے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دیگر تمام انبیائے کرام علیہم السلام کے اس وصف کو اپنانے والے بن جائیں۔ اپنے قول کے بھی سچے بن جائیں، عمل کے بھی سچے بن جائیں، سچائی کی یہ صفت ہمارے اندر رَچ بَس جائے۔ جھوٹ سے ہمیں نفرت ہو جائے، کسی بھی حالت میں جھوٹ ہماری زبان پر آنے ہی نہ پائے۔

لہٰذا ہم سب یہ نیت کر لیں کہ

۱۔ کسی کے بھی ڈر سے کبھی سچ نہیں چھوڑیں گے۔ امی کا کام نہیں کر سکے، ابو کا کوئی نقصان کر بیٹھے، کوئی اور غلطی سرزد ہوگئی تو جھوٹ بول کر جان چھڑانے کے بجائے سچ بول کر اپنی غلطی کا اعتراف کر لیں گے اور معافی مانگ لیں گے کہ مجھ سے غلطی ہوگئی، میں معافی چاہتا ہوں۔

پھر اِس کے بعد آئندہ ایسی کوتاہی سے بچنے کی کوشش کریں، تاکہ ہم ایک اچھے انسان بن سکیں۔

یاد رکھیں! ہم جھوٹ بول کر وقتی طور پر اگر بچ بھی گئے تو اپنے پیارے رب کو تو ناراض کر بیٹھیں گے اور لوگوں کی نگاہوں میں بھی گر جائیں گے۔ ہمارے دین اسلام نے تو ہمیں ایک اصول سکھایا ہے، اسی اصول میں ہی ہماری کامیابی اور راحت ہے کہ

''نجات تو سچ سے ہی ملتی ہے اور جھوٹ تو ہلاکت کا شکار کر دیتا ہے۔''

گویا جھوٹ بول کر آدمی ایک نہ ایک دن ضرور پھنس جاتا ہے، اگرچہ وقتی طور پر بچ جائے۔

۲۔ دوسرا عزم ہم یہ کریں کہ مذاق میں بھی جھوٹ بولنے سے پرہیز کریں گے۔ وقتی تفریح، دل لگی اور ہنسی مذاق بھی ایسا بات نہیں کریں گے جو جھوٹ، خلافِ حقیقت یا خلافِ واقعہ بات پر مشتمل ہو۔

سراپا رحمت و شفقت کے پیکر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسے شخص کے لیے تین مرتبہ سخت الفاظ ارشاد فرمائے ہیں جو لوگوں کو ہنسانے کے لیے جھوٹ بولتا ہے۔ فرمایا:

۱۔ تباہی ہے، ۲۔ دردناک عذاب ہے، ۳۔ ہلاکت ہے ایسے آدمی کے لیے۔

(ابوداود: ۴۹۹۰)

لہٰذا ہم یہ ٹھان لیں کہ ہر صورت میں، ہر حالت میں، ہر موقع پر اور ہر معاملے میں جھوٹ کی نحوست سے اپنی زبان کو پاک رکھیں گے۔ سچ، سچ اور صرف سچ ہی کو اپنا شیوہ بنائیں گے اور صدق اور سچائی کو اپنی پہچان اور شناخت بنائیں گے۔

ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک دعا سکھلاتے تھے۔ ہم بھی اس دعا کو یاد کر کے ہر نماز کے بعد پڑھیں تو ان شاء اللہ! اللہ تعالیٰ ہمیں بھی سچ بولنے والا بنا دیں گے۔ اس دعا کو اپنی ڈائری میں یا کسی کاغذ پر خوب صورت انداز سے لکھ لیں اور یاد کر لیں:

اَسْاَلُكَ لِسَانًا صَادِقًا وَ قَلْبًا سَلِيْمًا

(سنن ترمذی، ۳۴۰۷)

ترجمہ: (اے اللہ!) میں آپ سے سچی زبان اور قلب سلیم کا سوال کرتا ہوں۔

آیئے! اپنے پیارے رب سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمارے لیے سچ بولنے کا عادی بننا آسان فرما دے۔ آمین!

بقیہ: آزادی کا سورج

ہر مضمون انگریزی میں پڑھانے کے بجائے اگر صرف ''ایک مضمون'' کے طور پر انگریزی زبان سکھائی جائے تو بچہ دنیا جہاں کی چیزیں خود بخود پڑھے گا۔''

دادا جان بولے۔

''جی دادا جان! اردو ہماری مادری زبان ہے، اس میں ہمیں ماہر ہونا چاہیے۔''

''اب میں انگریزی نہیں پڑھوں گی، عربی، اردو پڑھوں گی، بل کہ اب تو میں فارسی بھی پڑھوں گی، جو انگریزوں نے ختم کر دی تھی۔'' صبوحی نے غصے سے کہا۔

''پھر امی ناراض ہو جائیں گی۔ دیکھو صبوحی! پھر تم انگریزی میں تبلیغ کیسے کرو گی؟'' قاسم نے سوچ کر کہا اور صبوحی ایک دم سے راضی ہوگئی۔

''ہاں، انھیں مسلمان بنانا چاہیے۔'' صبوحی نے ٹھنڈے لہجے میں کہا اور دادا ابو نے کہانی کا سلسلہ جوڑا۔

.....(جاری ہے).....

قرآن کوئز ۱۴

سعد علی چھیپا۔ کراچی

عزیز قارئین! پیشِ خدمت ہے ایک نیا انعامی سلسلہ بنام ''قرآن کوئز''، جس میں آپ سے اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ''قرآن کریم'' کے بارے میں پانچ سوال پوچھے جائیں گے۔ صحیح جواب دینے پر آپ کو ملے گا بہترین انعام......

تو دیجیے جواب اور لیجیے انعام......

آپ کا جواب کوپن کے ساتھ ۳۱، اکتوبر ۲۰۲۱ء تک ہمیں مل جانا چاہیے۔

سوال

۱. قرآن میں سب سے بڑا کلمہ ''فَاَسْقَيْنٰكُمُوْهُ'' ہے۔ یہ کس سورت میں ہے؟
۲. قرآن میں کتنی سورتیں ہیں جو ''اِذَا'' سے شروع ہوتی ہیں؟
۳. کون سی سورت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر دو مرتبہ نازل ہوئی؟
۴. کس سورت کی پہلی آیت اور آخری آیت میں لفظ ''اللہُ'' آیا ہے؟
۵. وہ کون سی سورت ہے جس کا اختتام دو نبیوں کے نام پر ہوا ہے؟

''ایک اچھے دوست کی ایک خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنے دوست کی ہر جائز خواہش کا تہ دِل سے احترام کرتا ہے۔

''ہم نے معنی خیز انداز میں ساجد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہم تمھاری بات کا مطلب نہیں سمجھے، جو کہنا ہے کھل کر کہو۔ ہم تمھاری ''تکلیف'' دور کرنے کی ہر ممکنہ کوشش کریں گے۔''

ساجد نے ہماری بارہ بجاتی صورت کا بغور معاینہ کرتے ہوئے لب کُشائی کی۔

''ہمیں ڈر ہے کہ تم ہماری خواہش کو رَد نہ کر دو۔ بس یہی ایک خدشہ ہے جو خاکسار کی جان کو کھائے جا رہا ہے۔''

ہم دماغ میں رینگتے خطرے کو زبان پر لے آئے۔

''دیکھو بابو! تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو بے دھڑک کہہ ڈالو، لیکن خدا کے لیے پہیلیاں نہ بجھواؤ۔''

اس نے دونوں ہاتھ اپنے لمبوترے کانوں پر رکھتے ہوئے احتجاج کیا۔

''بات دراصل یہ ہے کہ ہم کرکٹ کھیلنا چاہتے ہیں۔ سچ میں ہمارا دل چاہتا ہے کہ ہم بھی تمھاری طرح میدان کے چاروں طرف چوکے چھکّے لگائیں۔ تم ہمیں کرکٹ کھیلنا سکھا دو گے؟''

ہم نے جھجکتے ہوئے مدعا عرض کیا۔

''تم اور کرکٹ کھیلو گے؟'' وہ حیرت بھرے انداز میں ہمیں سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''تمھیں زمین پر صحیح طرح چلنا تو آتا نہیں اور خواہش کرتے ہو پہاڑ پر چڑھنے کی۔ مفت میں مارے جاؤ گے۔ اب بھی وقت ہے تائب ہو جاؤ، فائدے میں رہو گے۔'' اس نے ہمیں ڈرانے کی کوشش کی۔

''تم کیسے دوست ہو، حوصلہ افزائی کرنے کے بجائے دل توڑنے پر اُتر آئے ہو۔ کیا اچھے دوست ایسے ہوتے ہیں؟''

ہم نے اس کی ''وارننگ'' کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کی غیرت کو للکارا۔

تعلقات کو خطرے میں دیکھ کر موصوف کی نیم بے ہوش غیرت ''کلاسیکل'' انداز میں انگڑائی لیتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئی اور اُس نے ہمیں کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے سوال کیا:

''کیا ناراض ہو گئے ہو؟''

''تم نے بات ہی ایسی کی ہے، ناراض نہیں ہوں گے تو اور کیا ہوں گے۔''

ہم نے لوہا گرم دیکھ کر فوراً چوٹ ماری۔

''اچھا بابا! سکھا دوں گا کرکٹ۔ اب غصہ تھوک دو۔'' اس نے مشروط طور پر عملاً گھٹنے ٹیک دیے۔

''کیاااا!'' ہم نے حیرت بھرے انداز میں پوچھا: ''کیا تم ہمیں کرکٹ کھیلنا سکھا دو گے؟''

''ہاں، ہاں ہاں، سکھا دوں گا۔ اب کیا اسٹامپ پیپر پر لکھ کر دوں؟'' وہ اپنے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر دائیں ہاتھ کی شہادت کی

اس کے بعد کیا ہوا؟

الطاف حسین۔ کراچی

انگلی لکھنے کے انداز میں چلاتے ہوئے بولا۔

''نہیں اس کی ضرورت نہیں، مسلمان کی زبان ہی اسٹامپ پیپر ہوتی ہے۔''

ہم نے اس سے آنکھیں چار کرتے ہوئے پوچھا:

''اب میرے لیے کیا حکم ہے؟''

''ایک کلو مٹھائی کے ساتھ.....'' اس نے اپنی ''ڈیمانڈ'' پیش کرتے ہوئے حکم دیا۔ ''کل شام ٹھیک چار بج کر پانچ منٹ پر نشتر پارک پہنچ جانا۔ میں تمھیں وہیں ملوں گا۔''

''ایک کلو مٹھائی کے ساتھ؟'' ہم نے جان بوجھ کر انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

''استاد کا منہ میٹھا کرنے والے شاگرد ہی کمال کو پہنچتے ہیں۔ میری بات سمجھ میں آئی یا نہیں۔'' اس نے نکتے کی بات سمجھائی۔

''سمجھ میں آ گئی استاد!'' ہم اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولے۔

''اب تم گھر جاؤ اور کل مقررہ وقت پر نشتر پارک پہنچ جانا۔'' اس نے دوبارہ تاکید کی۔

''جو حکم استاد!'' جواب میں ہماری باچھیں خوشی سے کانوں تک پھیل گئیں۔

ہم فرطِ جذبات سے بے قابو ہو کر آگے بڑھے اور اپنے ہونے والے استاد کو بازوؤں میں جکڑ کر قدرے زور سے بھینچا اور پھر اُس سے ہاتھ ملا کر خیالوں ہی خیالوں میں چوکے چھکّے لگاتے ہوئے اپنے گھر کی جانب چل دیے۔

.....☆.....

اگلے دن ہم مقررہ وقت پر ایک کلو مٹھائی کے ساتھ نشتر پارک پہنچ گئے، لیکن ساجد اُستاد کا دُور دُور تک کوئی اتا پتا نہ تھا۔ ایسی صورتِ حال میں ہم نے مٹھائی کی تھیلی کو درخت سے لٹکا کر وہ کوفت بھرا عمل شروع کر دیا جسے یار لوگ ''انتظار'' کا نام دیتے ہیں۔

ع کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

ٹھیک ساڑھے پانچ بجے ساجد اُستاد اپنی پھٹیچر سی ''پھٹ پھٹی'' پر مشرقی روایات کی پاس داری کرتے ہوئے نشتر پارک کے مرکزی دروازے سے ''اِن'' ہوتا دکھائی دیا۔ ہمارے قریب پہنچ کر اُس نے موٹر سائیکل کو روکا۔ چند لمحوں تک ہمیں انتہائی غصے سے دیکھتا رہا اور پھر یک دم پھٹ پڑا:

''احمق..... بے وقوف..... اُلّو!''

اور ہمارا سَر اُس کی ''نوازشوں'' کی تاب نہ لاتے ہوئے خود بخود جھکتا چلا گیا۔

جب ساجد اُستاد کے دل کا بوجھ ذرا ہلکا ہوا تو وہ موٹر سائیکل سے اترتے ہوئے بولا:

''اصولاً مجھے آنا تو نہیں چاہیے تھا، لیکن اپنا وعدہ اور دس سال پرانی دوستی آڑے آ گئی۔''

''استاد! میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا؟''

ہم جان بوجھ کر انجان بن گئے، حالاں کہ ہمیں کل رات والی ''واردات'' اچھی طرح یاد تھی، جب ہم نے اسے پیش کی جانے والی حلیم کی پلیٹ میں مسالا حد سے کچھ زیادہ تیز کرا دیا تھا اور اُس نے حلیم کھا تو لیا تھا، لیکن شاید اُس کا اثر ابھی تک اس کے دماغ پر تھا۔

''احمق! تم نے کل رات جو ''حرکت'' کی تھی کیا اسے بھول گئے ہو؟'' اس کے لہجے میں ابھی تک ناگواری کا زہر بھرا ہوا تھا۔

''ہمیں افسوس ہے! ہم بہت شرمندہ ہیں! ہمیں سچے دل سے معاف کر دیں، آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔'' ہم نے ہاتھ جوڑتے ہوئے سَر کو مزید جھکا لیا۔

''تم تو جانتے ہو کہ ہمارا معدہ بہت کمزور ہے، ایسا ستم سہہ نہیں سکتا۔ ہم تو کل سے یہ سوچ سوچ کر پاگل ہوئے جا رہے ہیں کہ اگر خدانخواستہ اس لمحے کچھ ''اور'' ہو جاتا تو.....'' اس نے خوف سے جھرجھری لیتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''استاد! پہلی اور آخری غلطی سمجھ کر بخش دیں تو آپ کی بڑی نوازش ہوگی۔'' ہم نے عاجزی سے کہا۔

''اچھا، ٹھیک ہے۔ جاؤ، آج تمھیں معاف کیا، لیکن آئندہ خیال رکھنا۔''

اس نے حاتم طائی کی روح کو اِس انداز سے شرمندہ کیا کہ اگر مرحوم زندہ ہوتے تو فیاضی کا یہ عالی شان مظاہرہ دیکھنے کے بعد موقع پر دَم توڑ جاتے۔

''کیا تم نے واقعی مجھے معاف کر دیا؟'' ہم نے معافی کی تصدیق چاہی۔

''ہاں، ہاں ہاں، معاف کر دیا۔ اَب جلدی سے مٹھائی کی تھیلی کو درخت سے نیچے اتارو۔''

اُس نے للچائی ہوئی نظروں سے مٹھائی کی تھیلی کی طرف دیکھتے ہوئے حکم دیا اور ہم نے فوراً تعمیل کر دی۔

''آج ہم تمھیں صرف کرکٹ کی ''تھیوری'' سمجھائیں گے۔'' وہ چم چم ''پر دست درازی'' کرتے ہوئے بولا۔ ''کل سے ان شاءاللہ! ہم ''پریکٹیکل'' شروع کریں گے، اور ہاں، ایک بات ذہن میں رکھنا، اب ہم تمھارے دوست کم اور اُستاد زیادہ ہیں۔'' ساجد اُستاد نے ہمیں نکتہ سمجھایا۔

''جی بہتر۔'' جواباً ہم نے بھی سر کو جھکاتے ہوئے فرماں برداری کی انتہا کر دی۔

قصہ مختصر، پہلے دن ساجد اُستاد نے ہمیں کرکٹ کے کھیل کی خاص خاص باتیں سمجھائیں اور دوسرے دن سے اس نے ہمیں کرکٹ کی تھیوری کے عرش سے پریکٹیکل کے فرش پر اُتار دیا اور ہم اس کا دامن تھام کر کرکٹ کے نشیب و فراز طے کرنے لگے۔

جیسے جیسے دن گزرتے جا رہے تھے۔ اس کے رویے میں تبدیلی آتی جا رہی تھی۔ پہلے ہفتے اس کا لہجہ نرم رہا، لیکن جوں ہی کرکٹ کو چنگ دوسرے ہفتے میں داخل ہوئی وہ ایک سخت گیر اُستاد کے روپ میں ڈھل گیا۔ اب وہ ذرا ذرا سی غلطی پر بغیر لحاظ کیے ہماری ''دستی'' اور ''لفظی'' عزت افزائی کر دیتا تھا اور ہمیں شاگرد ہونے کے ناتے اس کا ہر ستم مسکرا کر سہنا پڑ رہا تھا۔ آخر وہ ہمارا اُستاد جو تھا اور ہم یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ استاد کی عزت اور تابع داری میں ہی کام یابی کا راز پوشیدہ ہوتا ہے۔

آٹھ ہفتے بعد جب اس نے کہا کہ اب تمھارے کھیل میں کافی بہتری آ گئی ہے تو ہمارا دل خوشی سے سینہ پھاڑ کر نکل جانے پر تل گیا!

.....☆.....

''کل ہمارے محلے کی کرکٹ ٹیم کا ''فتوالیون'' سے دوستانہ میچ ہے اور میری کوششوں سے تمھیں بھی محلے کی کرکٹ ٹیم میں شامل کر لیا گیا ہے۔ اس ''چانس'' کو ضائع نہیں کرنا۔ اپنے استاد کی عزت کا ہر لمحہ دھیان رکھنا۔ اب ہماری ناک کو قائم رکھنا تمھارے لیے فرض کا درجہ رکھتا ہے۔''

نویں ہفتے کے چوتھے دن ساجد اُستاد نے ہمیں یہ خوش خبری سنائی تو ہم نے خوشی سے بے قابو ہو کر اُس کا ماتھا چوما اور پھر اُسے پھرتی سے گلے لگا لیا۔

''استاد! آپ فکر نہ کریں۔ ایسا ایکشن دکھاؤں گا کہ کیا غیر کیا اپنے، سبھی اَش اَش کر اُٹھیں گے۔''

ہم نے سینہ پھلانے کی کوشش کرتے ہوئے ''بھڑک'' ماری۔

''مجھے تم سے یہی امید ہے!'' ساجد اُستاد کے چہرے پر بھی ہمارا جواب سن کر خوشی کی لہر دوڑ گئی!

.....☆.....

دونوں ٹیموں کے کپتان ''ٹاس'' کے لیے میدان میں اتر چکے تھے۔ ''ٹاس'' ہوا اور ''فیلڈنگ'' ہماری ٹیم کا نصیب ٹھہری۔ ''فتوالیون'' کے ''اوپنرز'' نے ''پچ'' پر پوزیشن سنبھالی اور ہماری ٹیم کے ''سورما'' ان کے گرد موجود دِفاعی لائنوں پر ڈٹ گئے۔ ہمیں کپتان نے ''سلپ'' پر تعینات کیا۔

کھیل شروع ہوا۔ رمضانی کی نپی تلی گیندوں کے باعث پہلا اوور ''میڈن'' رہا، لیکن نور کے اوور میں لمبے قد والا اوپنر ایک چھکے کی مدد سے دس رنز بنانے میں کام یاب ہو گیا۔ آغاز ہی میں مخالف ٹیم کا یہ ستم ہمارے لیے ناقابل برداشت تھا۔ ہم دوڑتے ہوئے کپتان کے پاس گئے۔

''کپتان صاحب! آپ ایک اوور ہمیں دے دیں اور پھر دیکھیں کہ ہم اس لمبو اُوپنر کی طبیعت کیسے ''کلین بولڈ'' کرتے ہیں۔'' ہم نے کپتان کو اپنی ''خدمات'' پیش کیں۔

''تیسرا اُوور رَمضانی کرائے گا، چوتھا اوور تمھیں دیا جائے گا۔''

کپتان نے ہمارے جذبات کا احترام کرتے ہوئے کہا اور ہم دوبارہ اپنے فیلڈنگ پوائنٹ پر آ کھڑے ہوئے۔

تیسرا اُوور کام یاب رہا اور رمضانی کے ہاتھوں جامنی صورت والا اوپنر، پویلین کی جانب سدھارا۔ کپتان نے چوتھے اوور کے لیے گیند ہماری جانب اچھال دی۔ ہم نے کسی منجھے ہوئے فیلڈر کی طرح کیچ کرنا چاہا، لیکن گیند ہمارے ہاتھوں میں آنے کے بجائے دھم سے ہمارے سر سے آ ٹکرائی۔ اگلے لمحے ہمیں میدان گردش کرتا ہوا محسوس ہوا، لیکن بات عزت کی تھی، لہٰذا کپتان کا یہ ''ظلم'' مسکرا کر سہہ جانا ضروری تھا۔

ہم نے پہلی گیند کرائی۔ لمبو بلے باز نے طنزیہ انداز سے ہمیں دیکھتے ہوئے زوردار شارٹ کھیل کر گیند کو ہوا کے دوش پر باؤنڈری لائن پار کرا دیا۔ ایمپائر کے چھکے کا اشارہ دیتے ہی تماشائیوں کے داد و تحسین کے نعروں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ ہم نے شرمندگی کے ساتھ ''تھرڈ مین'' پر موجود ساجد اُستاد کی طرف دیکھا اور پھر ہماری شرمگیں نظریں ان کے غصیلے چہرے سے سلپ ہو کر ''سیکنڈ سلپ'' پر کھڑے کپتان کی صورت سے جا ٹکرائیں، جو ہمیں شعلہ بار نگاہوں سے یوں گھور رہا تھا جیسے ہمیں اُبالے بغیر کھا جائے گا۔

''ارے، پریشان نہ ہوں کپتان صاحب! حوصلہ رکھیں، میں ابھی کھیل کا پانسا پلٹ دوں گا!'' ہم نے نظروں ہی نظروں میں کپتان کی ہمت بندھائی۔

دوسری گیند ''باؤنس'' کا لبادہ اوڑھ کر لمبو بلے باز کے سر کے اوپر سے گزر گئی۔ غریب نے بڑی مشکل سے خود کو ہمارے حملے سے بچایا۔ اگر وہ بروقت ''کریز'' پر جھک نہ جاتا تو اُس کے ''ناریل'' (سر) سے تیل نکل جانا یقینی تھا۔

کپتان کے دھواں ہوتے چہرے پر یک دم خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اس

نے ہاتھ کے اشارے سے ہمیں ''خراجِ تحسین'' پیش کیا اور ہم خوشی سے پھول کر کُپا ہوتے ہوتے رہ گئے۔ تیسری گیند پر کوئی رَن نہیں بنا۔ کپتان نے ہمارے قریب آ کر ہماری پیٹھ تھپتھپا کر شاباش دی۔ چوتھی گیند پر ہمارے ''تعاون'' سے مخالف ٹیم کے اسکور میں تین رنز کا اضافہ ہو گیا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر کپتان کے تیور پھر بدل گئے۔ مطلع ایک بار پھر اَبر آلود ہو چکا تھا، لیکن ہم نے اس کی پروا کیے بغیر پانچویں گیند کرائی۔ اس کا حشر کیا ہوا؟ کیا یہ بتانا کافی نہیں کہ لمبو بلے باز کے بلے سے ٹکرانے کے بعد گیند فضاؤں سے ہم کلامی کرتی ہوئی باؤنڈری پار کر گئی!

''چھکا!'' میدان زوردار نعرے سے گونج اٹھا۔

ہم نے دیکھا، کپتان صاحب کا چہرہ غصے کی شدت سے سرخ کم، سیاہ زیادہ ہو گیا تھا۔ اس سے زیادہ بُری حالت ہمارے ساجد اُستاد کی تھی، لیکن شاید وہ نہیں جانتے تھے کہ تقدیر کے لکھے کو مٹانا انسان کے بس کی بات نہیں ہوتی، جو لکھا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔

اب چھٹی اور آخری گیند باقی رہ گئی تھی اور ہماری خواہش تھی کہ ٹیڑھی مونچھوں والا بلے باز اُس کی بھینٹ چڑھ کر پویلین میں ''رپورٹ'' کرے، لیکن بعض اوقات انسان جو سوچتا ہے، جیسا چاہتا ہے ویسا ہوتا نہیں۔ اس وقت ہمارے نصیب میں بھی کچھ ایسی ہی گردش لکھی ہوئی تھی۔ جوں ہی ہم نے آخری گیند کرائی ٹیڑھی مونچھوں والے بلے باز نے بڑے نخرے سے ہٹ لگائی۔ گیند ''ناقابلِ دست درازی فیلڈراں'' کے لیبل کے ساتھ فضاؤں کا سینہ چیرتی ہوئی باؤنڈری کے باہر بیٹھے دھوتی میں ملبوس تماشائی کے سر سے جا ٹکرائی۔ اس نے تکلیف سے بلبلاتے ہوئے ''چھکے'' کا اعلان کیا اور اگلے لمحہ اپنا ''آلو نما'' سر اپنے دائیں جانب بیٹھے تماشائی کی گود میں رکھ دیا اور اُس نے تیزی سے اس کے سَر کی ''رگڑی'' شروع کر دی۔

صورتِ حال اتنی مضحکہ خیز تھی کہ ہم بے اختیار کھلکھلا اُٹھے۔ ایک لمحے کے لیے تو ہمیں یہ بھی یاد نہ رہا کہ ہم کہاں کھڑے ہیں؟ اچانک کسی نے عقب سے ہمیں دھکا دیا۔ ہم نے سنبھلتے ہوئے پیچھے مڑ کر دیکھا تو کپتان صاحب ہمیں گھور رہے تھے۔

''لمبو بلّے باز کو آؤٹ کر دیا؟ بڑے آئے بولر کہیں کے!''

انھوں نے انتہائی تلخ لہجے میں طنز کا نشتر مارا اور ہم پیر پٹختے ہوئے آگے بڑھ گئے اور خاموشی سے ''سلپ'' پر آ کھڑے ہوئے۔ اچانک ہماری نظر اپنے استاد پر پڑی تو وہ ہمیں اپنی ٹھوڑی پر ہاتھ پھیرنے کے بعد شہادت کی انگلی ہلاتے دکھائی دیا۔ اس کا مطلب تھا کہ میچ ختم ہونے دو، میں تمھارا بندوبست کرتا ہوں۔ ہم نے فوری طور پر اُس طرف سے توجہ ہٹا کر بیٹنگ کرنے والے لمبو بلے باز پر لگا دی، لیکن دل ہی دل میں ہم ڈر رہے تھے کہ ساجد اُستاد ہمیں کوچنگ سے محروم کر دے گا۔

......☆......

انچاسویں اوور تک ''فتوالیون'' نے چھے وکٹوں کے نقصان پر دو سو گیارہ رنز بنا لیے تھے۔ پچاسواں اور آخری اوور شروع ہو چکا تھا۔ اس اوور کی دوسری گیند کو ٹھگنے بلے باز نے ہماری طرف ''ہٹ'' کیا۔ اس سے پہلے کہ ہم سنبھلتے گیند انتہائی برق رفتاری سے بجلی پرواز کرتی ہوئی ہماری دائیں طرف کی پسلیوں میں کرنٹ دوڑاتی ہوئی آگے نکل گئی۔ ہم نے تیزی سے پسلیوں کو سہلاتے ہوئے خوف زدہ انداز میں ٹھگنے بلے باز کی طرف دیکھا تو وہ معنی خیز انداز سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔ ہمیں اس لمحے یوں محسوس ہوا جیسے کہہ رہا ہو: ''پسلیوں میں گھس گئی کیا؟''

''ہٹ ہی ایسی تھی!'' ہم نے نظروں ہی نظروں میں اقرار کیا تو وہ دوبارہ مسکرایا اور ہم دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گئے۔

پچاسویں اور آخری اوور میں 'فتوالیون'' نے اسکور دو سو اِکیس رنز تک پہنچا دیا تھا اور اِس دوران میں ہمارے ماتھے پر ایک عدد'' آلو'' بھی نمودار ہو چکا تھا، جو سیکنڈ لاسٹ گیند کو کیچ کرنے کی کوشش میں ہمیں ''ہدیتاً'' ملا تھا۔

کچھ دیر بعد ہماری ٹیم کے اوپنرز، نور اور عزیز جوابی کارروائی کے لیے کریز پر موجود تھے۔ خدا کی شان دیکھیے کہ پہلے اوور کی پہلی گیند پر چھکا لگانے کی کوشش میں نور فوری طور پر ''بولڈ'' ہو گیا اور ''ڈک (duck)'' کا ''اعزاز'' حاصل کر کے پویلین لوٹ آیا۔

ہمارے ساجد اُستاد کو ''ون ڈاؤن'' بھیجا گیا۔ اس نے نہایت محتاط انداز میں بیٹنگ کرتے ہوئے دسویں اوور میں اسکور اڑتالیس رنز تک پہنچا دیا۔ گیارہویں اوور کی تیسری گیند پر وہ چھکوں کی ''ہیٹ ٹرک'' کرنے کی کوشش میں پویلین کو پیارا ہو گیا۔ اس کے آؤٹ ہونے کے بعد مخالف ٹیم کے بولروں نے ہمارے کھلاڑیوں کا جلوس نکال دیا۔ ایک آتا تھا، دوسرا جاتا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے بدقسمتی ہاتھ منہ دھو کر ہمارے پیچھے پڑ گئی ہے۔

ظلم کی انتہا دیکھیے کہ صرف دو کم ستّر کے اسکور پر ہماری ٹیم کے چھے کھلاڑی آؤٹ ہو چکے تھے۔ ان میں سے تین نے ''ڈک'' کا ''اعزاز''

حاصل کیا تھا۔ نیا کھلاڑی نوید مخولیا اپنی گرتی ہوئی پتلون سنبھال سنبھال کر اِسکور ایک سو نو تک لے گیا اور پھر وہ بھی کریز سے ''غائب'' ہوگیا۔

اس کے بعد کپتان صاحب نے میدان کو رونق بخشی۔ انھوں نے بچ بچا کر کھیلنے کی پالیسی کے تحت رنز میں کم اور اُوور میں زیادہ اضافہ کرایا۔ جب ان پر بُرا وقت آیا تو آگے نکل نکل کر کھیلنے کی ''شوبازی'' کرنے لگے، جو کہ اللہ تعالیٰ کو بالکل پسند نہیں۔ چالیسویں اوور کی آخری گیند کو کھیلنے کے لیے کپتان صاحب وقت سے پہلے ہی ''ڈینجر زون'' میں داخل ہوگئے اور پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا، گیند اُنھیں ''ڈاج'' کرتی ہوئی وکٹ کیپر کے ہاتھوں میں پہنچی، اس نے نہایت پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ''گِلیاں'' اُڑا دیں اور کپتان صاحب منہ بسورتے ہوئے ہمارے درمیان آکر بیٹھ گئے۔

نویں کھلاڑی کے ''ڈک'' بننے کے بعد کپتان نے ہمیں قربانی کا بکرا بنا کر میدان میں بھیجا۔ اس وقت ہماری ٹیم کا اسکور ایک سو ستاون رنز، نو کھلاڑی آؤٹ تھا اور کھیل کا بیالیسواں اوور شروع ہوا چاہتا تھا۔ حفاظتی اقدامات کرنے کے بعد ہم بلا گھماتے ہوئے کریز پر پہنچے۔ سب سے پہلے ہم نے چور نظروں سے 'فتو الیون'' کے فیلڈرز کو دیکھا جو ہمیں یوں گھور رہے تھے جیسے ہم نے سب سے ادھار لے رکھا ہو اور بولر، اس پر تو پہلی نظر پڑتے ہی ہمارا ننھا سا دِل اچھل کر حلق میں آگیا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں گیند اُچھالتے ہوئے ہمیں اس انداز سے دیکھ رہا تھا جیسے پہلی ہی گیند میں وہ ہمارے ''ناریل'' کے دو ٹکڑے کر دے گا۔

اس لمحے ہم نے سب پہلے اس وقت کو کوسا جب کرکٹ سیکھنے کی خواہش نے ہمارے دل میں سر اُٹھایا تھا اور پھر بلے کو ایک ہاتھ میں تھام کر دوسرے ہاتھ سے چھے سات بار گلے سے دل کی قیام گاہ تک یوں ہاتھ پھیرا جیسے دل کو واپس اپنے مقام پر آجانے کے لیے راضی کر رہے ہیں، لیکن دل تھا کہ ضد پر اَڑا ہوا تھا۔

''کیا بات ہے بھئی، کوئی تکلیف وغیرہ تو نہیں ہے؟''

ایمپائر نے پرانی سی پلاسٹک کی تھیلی میں سے نسوار کی چٹکی بھرتے ہوئے ہمارے قریب آکر پوچھا۔

''جی نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔'' ہم نے گھبرائے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

''تو پھر سیدھے ہو کر کھیلو نا!'' ایمپائر نے ''پچ'' پر ''سبزہ زاری'' فرماتے ہوئے کہا۔

ہم نے جلدی جلدی گگلی کی طرح اچھلتے دل کو کھیلنے پر آمادہ کیا اور بلے کو مضبوطی سے پکڑ کر بولر کی طرف دیکھنے لگے، جو حملہ کرنے کے لیے ''اسٹارٹ'' ہو چکا تھا۔ ایمپائر کے پاس پہنچ کر اُس نے گیند کو اپنے ہاتھوں سے آزاد کیا۔ اگلے لمحے گیند بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ہماری طرف بڑھی، اس سے پہلے کہ وہ ہمارے سر سے ٹکراتی ہم پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نیچے بیٹھ گئے اور گیند نے وکٹوں کے پیچھے موجود وِکٹ کیپر کا جبڑا ہلا کر رکھ دیا!

''ہائے ئے ئے! مر گیا! اماں جی! میں تو مر گیا! اوئے، میں مر گیا!''

وکٹ کیپر درد سے بلبلاتے ہوئے رکوع کے بغیر سجدہ ریز ہوا اور پھر چاروں شانے چت ہوگیا۔ ایمپائر دوڑتا ہوا اُس کے پاس پہنچا۔ جھک کر دیکھا تو وکٹ کیپر کے جبڑے پر ہمارے ماتھے کے ''آلو'' سے قدرے چھوٹے سائز کا ''آلو'' نمودار ہو چکا تھا، جسے آپ ''گومڑی'' بھی کہہ سکتے ہیں۔

اسی اثنا میں دوسرے کھلاڑی بھی وکٹ کیپر کے اردگرد جمع ہو چکے تھے۔

اگلے چند منٹ میں حکیم جمال گوٹیا بھی اپنے دو رُکنی عملے سمیت ''جائے حادثہ'' پر پہنچ چکے تھے۔ انھوں نے وکٹ کیپر کے جبڑے کو پکڑ کر پوری قوت سے ہلایا تو وکٹ کیپر نے ''نعرۂ فریاد'' بلند کرتے ہوئے اپنی رہائی کا مطالبہ کیا۔ مخالف ٹیم کے کپتان نے یہ کہتے ہوئے اس کی ''قرارداد'' نامنظور کر دی کہ ''خاموشی سے لیٹے رہو، حکیم صاحب تم سے بہتر جانتے ہیں۔''

حکیم جمال گوٹیا نے اپنے عملے کے ایک رکن سے اشاروں ہی اشاروں میں کچھ کہا۔ جواباً اس نے تھرماس میں موجود گرم پانی گلاس میں بھرا اور پھر ایک چھوٹی سی بوتل میں موجود سرخ رنگ کے محلول کے چند قطرے گلاس میں ٹپکائے۔

''یہ لیجیے، انھیں پلا دیجیے۔'' حکیم جمال گوٹیا گلاس کپتان کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔ ''پلک جھپکتے میں مریض ہشاش بشاش ہو جائے گا۔''

''حکیم صاحب! مریض کو بیرونی چوٹ بھی آئی ہے۔ کوئی مرہم وغیرہ بھی لگا دیجیے۔'' کپتان بولا۔

''یہ دوا جو میں نے دی ہے، یہ بیرونی اور اندرونی، ہر طرح کی تکلیف کے لیے اکسیر کا درجہ رکھتی ہے۔ آپ بے غم ہو کر مریض کو پلا دیجیے اور پھر ''اثر'' دیکھیے۔'' حکیم جمال گوٹیا نے لفظ ''اثر'' پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''حکیم صاحب! یہ ہے کیا بلا؟'' کپتان نے گلاس میں موجود سُرخ محلول کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اس کا نام ہے: ''شربت گڑگڑاہٹ زوروالا''۔ میں نے حال ہی میں یہ دوا تیار کی ہے۔'' حکیم جمال گوٹیا نے فخریہ انداز میں دوا کا نام

بتاتے ہوئے وکٹ کیپر کی طرف معنی خیز انداز سے دیکھا۔

''ہائے ئے ئے ئے!!'' وکٹ کیپر نے نعرۂ تکلیف بلند کیا۔

''دیکھیے، مریض سخت تکلیف میں دکھائی دے رہا ہے، وقت ضائع کیے بغیر اِسے دوا پلا دیجیے۔'' حکیم جمال گوٹیا، وکٹ کیپر کو ہمدردانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے۔ ''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، اگر خدانخواستہ یہ میدان سے بھاگتا بھی ہے تو آپ سے آسانی اسے ''ٹریس'' کرلیں گے، کیوں کہ یہ جدھر سے گزرے گا اپنے پیچھے ''داستان'' چھوڑ جائے گا!''

''نہیں نہیں، نہیں۔ میں ایسی دوا نہیں پیوں گا۔ خدارا! مجھ پر رحم کیجیے! میں بالکل ٹھیک ہوں، مجھے کسی دوا کی ضرورت نہیں ہے۔'' وکٹ کیپر نے لیٹے لیٹے ہاتھ جوڑ کر درخواست کی۔ غالباً اسے مستقبل قریب میں پیش آنے والے مسائل کا بخوبی اندازہ ہوگیا تھا۔ اگلے لمحے وہ پھرتی سے اٹھ کر تیر کی طرح سیدھا کھڑا ہوگیا۔

''آہاہاہاہا..... ہاہاہاہاہا!'' حکیم جمال گوٹیا فلک شگاف قہقہہ لگا کر بولے: ''دیکھا حکیم جمال گوٹیا کا کمال! ابھی تجویز کردہ دوا گلاس میں ہے اور مریض اٹھ کر بیٹھنے کے بجائے کھڑا ہوگیا ہے۔''

''حکیم صاحب! آپ کی دوا کا نام ہی ایسا خوف ناک ہے کہ اگر مردے کے سرہانے کھڑے ہوکر دُہرایا جائے تو وہ بھی کفن سمیت اٹھ کر بھاگ جائے گا۔''

ہم نے پہلی بار اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔

حکیم جمال گوٹیا نے ہمیں کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور اپنے دورکنی عملے سمیت غصے سے پیر پٹختے ہوئے باؤنڈری کی طرف چل پڑے۔

چند منٹ کے بعد کھیل دوبارہ شروع ہوا۔ اسی جبڑا توڑ بولر نے ہم پر دوسرا حملہ کیا۔ ہم نے بایاں گھٹنا کریز پر ٹیک کر گیند کو کھیلنے کی کوشش کی، لیکن گیند بیٹ پر آنے کے بجائے براہ راست ہمارے سینے پر آ لگی۔

''تڑ ررن..... تڑ ررن..... تڑ ررن'' کی آوازیں سنائی دیں اور ہمارے دائیں بائیں فیلڈنگ کرنے والوں نے ہمیں حیرت بھرے انداز میں دیکھا اور ہم شان بے نیازی سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے دشمنوں کو باور کرانے کی کوشش کرنے لگے کہ ہم کوئی معمولی بلے باز نہیں ہیں، پورے بندوبست کے ساتھ میدان میں اترے ہیں۔ اب انھیں یہ تو نہیں بتا سکتے تھے کہ سینے پر بندھی ''ٹرے'' کے باعث اللہ تعالیٰ نے ہمیں مرنے سے بچا لیا تھا۔

ہم نے طنزیہ انداز میں بولر کو اگلی گیند کرانے کا اشارہ کیا۔ اس نے ہمیں رشک بھرے انداز میں دیکھا اور پھر گیند اُٹھا کر اپنے ''اسٹارٹنگ پوائنٹ'' پر جا کر رُک گیا۔ چند لمحے تک کچھ سوچنے کے بعد اُس نے دوڑنا شروع کیا، لیکن اس مرتبہ اس کی رفتار میں پہلی جیسی تیزی نہیں تھی۔ اِدھر ہم نے سوچ لیا تھا کہ اس گیند پر چھکا ماریں گے۔ جوں ہی گیند اُس کے ہاتھ سے نکل کر ہماری طرف آئی ہم نے ''بیٹنگ پوائنٹ'' سے تین قدم آگے نکل کر جارحانہ انداز میں بلا گھما دیا۔ اگلے لمحے ہمیں اپنے عقب میں کسی چیز کے گرنے کی آواز سنائی دی۔ مڑ کر دیکھا تو دو وکٹیں زمین بوس ہوچکی تھیں اور ایک وکٹ تنہا کھڑی ہمارے ''کلین بولڈ'' ہونے کا اعلان کر رہی تھی۔ ہم نے ایمپائر کی طرف دیکھا تو وہ بھی مسکراتے ہوئے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی کھڑی کرکے ہمیں کریز سے رخصت ہونے کا اِشارہ دے رہا تھا۔

اس ''سانحے'' کے رونما ہوتے ہی کھیل کا فیصلہ ہوگیا۔

''فتوالیون'' نے اپنی مؤثر حکمت عملی کے باعث میچ جیت لیا تھا اور ہماری ٹیم کے کھلاڑیوں کی انفرادی طور پر داد سمیٹنے کی پالیسی ہماری ''شان دار'' شکست کی بنیادی وجہ بنی تھی۔

اس کے بعد کیا ہوا؟ وضاحت کی ضرورت نہیں۔

آپ ماشاءاللہ سیانے ہیں! خود سمجھ لیجیے۔

خونی جمناسٹر ۳

محمد واصف شیراز۔ کراچی

''کیا! کوئی انجان آدمی رات کے دو بجے میرے کمرے میں آیا تھا؟'' مسٹر عقیل بولے، جو سب انسپکٹر کاشف کے سامنے بیٹھے تھے۔

''جی ہاں، ہم نے کیمرا ریکارڈنگ میں دیکھا ہے کہ ایک آدمی آپ کے کمرے میں آیا اور ایک منٹ اندر رہ کر چلا گیا۔'' سب انسپکٹر کاشف بولے۔

''سر! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مجھے کچھ نہیں معلوم۔ مجھے تو بلاوجہ پھنسایا جارہا ہے۔ میں تو کل رات گیارہ بجے سو گیا تھا۔'' مسٹر عقیل بولے۔

''اچھا مسٹر عقیل! یہ بتایئے کہ وہ آدمی آپ کے کمرے میں کیا لے کر آیا تھا، جو واپس جاتے ہوئے وہ نہیں لے کر گیا؟'' سب انسپکٹر کاشف نے پوچھا۔

''سر! میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' مسٹر عقیل بولے۔

''اچھا!'' سب انسپکٹر کاشف سوچ میں پڑ گئے۔

.....☆.....

''ٹن.....ٹن.....'' انسپکٹر غوری نے گھنٹی کا بٹن دبایا۔ دو منٹ بعد ہی ایک بھاری بھرکم سے آدمی نے دروازہ کھولا۔

''آپ مسٹر عاصم ہیں؟'' انسپکٹر غوری بولے۔

''جی ہاں، آیئے اندر آیئے۔ بتایئے میں آپ کی کیا مدد کرسکتا ہوں؟'' مسٹر عاصم نے انسپکٹر غوری کو کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

''کچھ نہیں، بس آپ مجھے یہ بتایئے کہ کل رات کو دو بجے آپ کراؤن ہوٹل کے کمرا نمبر 302 میں کیوں گئے تھے؟'' انسپکٹر غوری بولے۔

''کیا مطلب!؟'' مسٹر عاصم خوف زدہ لہجے میں بولے۔

''مطلب کس بات کا پوچھ رہے ہیں آپ!؟ کل رات ہوٹل کراؤن میں آپ کیا کر رہے تھے، جب کہ آپ نے ایک ہفتے کی چھٹیاں لی ہوئی ہیں؟'' انسپکٹر غوری سرد لہجے میں بولے۔

''سر! میں بتاتا ہوں۔ پچھلے ہفتے میرے پاس ایک انجان کال آئی اور مجھے کہا گیا کہ میرے بیٹے کو اغوا کرلیا گیا ہے۔'' مسٹر عاصم بولے۔

''کیا!'' انسپکٹر غوری بہت زور سے اچھلے۔

''جی ہاں سر! پھر مجھے کہا گیا کہ تھوڑی دیر میں مجھے ایک لفافہ موصول ہوگا جس میں ساری ہدایات لکھی ہوں گی۔ قریباً دس منٹ بعد ہی مجھے ایک لفافہ موصول ہوا۔ اسے جب میں نے پڑھا تو گویا مجھے سانپ سونگھ گیا۔'' مسٹر عاصم بولتے چلے گئے۔

''لفافے میں کیا تھا؟'' انسپکٹر غوری نے پوچھا۔

''ایک منٹ سر! میں آپ کو لفافہ لا کر دکھاتا ہوں۔'' مسٹر عاصم بولے۔ جلد ہی مسٹر عاصم لفافہ لے آئے اور انسپکٹر غوری کو تھما دیا۔ لفافے میں موجود خط پڑھتے ہی ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں، خط میں لکھا تھا:

''عاصم! تمھارا بیٹا ہمارے پاس ہے، مگر وہ تمھیں اس صورت میں ملے گا جب تم ہمارا ایک کام کرو گے۔ کام یہ ہے کہ تم نے چپکے سے ہوٹل کراؤن سے ماسٹر چابی چرانی ہے اور ایک ہفتے کی چھٹی لینی ہے، پھر تم اس لفافے کے ساتھ جو دوسرا پیکٹ موصول ہوا ہے اسے اپنے ساتھ ہوٹل لے جاؤ گے اور ماسٹر چابی بھی۔ ہوٹل میں حلیہ بدل کر اور اپنا چہرہ بدل کر جانا اور رات کے دو بجتے ہی ہوٹل کے کمرا نمبر 302 میں جا کر اس پیکٹ کو جو تمھیں خط کے ساتھ موصول ہوا ہے، جا کر کہیں بھی رکھ دینا اور کمرے کو ماسٹر چابی سے کھولنا، جسے تم نے چُرایا ہوگا۔ یہ

کام کرنے کے بعد ہوٹل کے کسی بھی خالی کمرے میں، جو تمھیں پتا ہو، رُک جانا اور صبح ہوتے ہی ہوٹل سے فرار ہو جانا۔ تمھیں تمھارا بیٹا جلد مل جائے گا۔ اس کام کو تین دن بعد، یعنی جمعرات کو کرنا اور اگر کسی کو بھی اس بات کی خبر ہوئی تو تمھارا بیٹا.....''

خط پڑھ کر اِنسپکٹر غوری دھک سے رہ گئے۔

''پھر مجھے فون کیا گیا اور مجھ سے یہ ہدایات سنی گئیں کہ مجھے بات سمجھ آئی ہے یا نہیں؟ پھر اُس شخص نے مجھ سے کہا کہ: ''میں یہ سب کچھ اس لیے کر رہا ہوں کہ ہوٹل کراؤن کے کمرا نمبر 302 میں میرا ایک بہت پرانا دشمن رُکا ہوا ہے جسے میں ختم کرنا چاہتا ہوں۔'' مسٹر عاصم بولے۔

''کیا! یعنی مسٹر عقیل جو کہ کمرا نمبر 302 میں رُکے ہوئے ہیں، ان کی کوئی جان لینا چاہتا ہے، مگر مسٹر عقیل کا قتل نہیں ہوا، مسٹر فاخر کا ہوا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ قاتل، مسٹر عقیل کو مارنا چاہتا ہے اور مر جاتے ہیں مسٹر فاخر!؟'' انسپکٹر غوری پریشان کُن لہجے میں بولے۔

''اچھا عاصم! ایک بات بتاؤ، تمھیں جو خط کے ساتھ دوسرا پیکٹ وصول ہوا تھا، اُس میں کیا تھا؟''

''سر! اس پیکٹ میں چند چھوٹی چھوٹی گولیاں تھیں۔'' مسٹر عاصم بولے۔

ایک بات بتاؤ عاصم! غلطی سے کہیں 302 کے بجائے وہ گولیاں تم نے 305 میں تو نہیں رکھ دیں؟'' انسپکٹر غوری بولے۔

''ارے نہیں سر!'' مسٹر عاصم بولے۔

''سب سے پہلے تو مسٹر عقیل کی حفاظت کا انتظام کرنا ہوگا، کیوں کہ ''خونی'' مسٹر عقیل کی جان لینے پر تُلا ہوا ہے اور جہاں تک میرا اندازہ ہے، وہ کوئی بہت پرانا دشمن ہے مسٹر عقیل کا، لیکن یہ ہو کیسے سکتا ہے کہ وہ مارنا چاہتا تھا مسٹر عقیل کو، جو کہ 302 میں مقیم ہیں، لیکن مر گئے مسٹر فاخر جو کہ 305 میں مقیم تھے، اور مسٹر عقیل بالکل صحیح سلامت ہیں۔

اچھا ایک بات بتایئے مسٹر عاصم! جب آپ مسٹر عقیل کے کمرے میں وہ سفید گولیاں رکھنے گئے تھے تو کیا اُس وقت مسٹر عقیل اُٹھے ہوئے تھے؟ میرا مطلب ہے کہ جاگ رہے تھے؟'' انسپکٹر غوری بولے۔

''نہیں سر! وہ تو خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔'' مسٹر عاصم بولے۔

اتنے میں انسپکٹر غوری کے فون کی گھنٹی بجی۔ اُنھوں نے فون اُٹھایا تو دوسری طرف سے انسپکٹر غوری کو اُن کے دوسرے اسسٹنٹ ''سب انسپکٹر چودھری'' کی آواز سنائی دی:

''سر! چودھری بات کر رہا ہوں۔''

''ہاں بولو چودھری! کیا بات ہے؟'' انسپکٹر غوری نے پوچھا۔

''سر! پوسٹ مارٹم کی رپورٹ وصول ہو گئی ہے۔'' سب انسپکٹر چودھری بولے۔

''اچھا، بہت خوب! میں تھوڑی دیر میں آفس پہنچتا ہوں۔'' انسپکٹر غوری نے کہا اور فون بند دیا۔

''سب سے پہلے تو میں کاشف کو فون کر کے مسٹر عقیل کے بارے ہدایت دیتا ہوں اور گولیوں کے بارے میں بتاتا ہوں، پھر رپورٹ پڑھنے دفتر جاؤں گا۔''

انسپکٹر غوری بڑبڑاتے ہوئے بولے، پھر فون کر کے سب انسپکٹر کاشف کو سارا ماجرا سنایا اور ہدایات دے کر وہاں سے چل پڑے۔

.....(جاری ہے).....

پری

عروبہ رحمٰن۔؟

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک خوب صورت پری، جس کا نام پرنیاں تھا۔ ایک دن اپنا پَر زخمی ہو جانے کی وجہ سے نیچے زمین پر آ گری اور گرتے ہی بے ہوش ہو گئی۔

جب پرنیاں کو ہوش آیا تو اُس نے دیکھا کہ وہ ایک نرم فرش میں دھنسی ہوئی ہے، جس کا رنگ بالکل سفید ہے۔

پرنیاں کو یاد کرنے پر بھی یاد نہیں آیا کہ آخر وہ اس انجان جگہ پر کس طرح زخمی حالت میں آ پہنچی۔ اسے اپنے خاندان والوں کا خیال آیا۔ وہ سب اسے بہت شدت سے یاد آنے لگے اور وہ خود کو اِنتہائی بے بس محسوس کرنے لگی۔ پرنیاں سوچنے لگی کہ ''کب تک وہ یوں ہی بے یار و مددگار پڑی رہے گی؟''

یہ سوچتے ہی دو گرم گرم آنسو اُس کی آنکھوں سے بہتے ہوئے اس کے ہاتھ پر آ گرے۔ اچانک اس کی نظر اپنے ہاتھوں کی طرف گئی۔ وہ یہ دیکھ کر بہت حیران ہوئی کہ اس کے ہاتھ جامنی رنگ کے ہو چکے ہیں اور اُس کے خوب صورت پَر اور باقی اعضا بالکل بے جان ہو چکے ہیں۔ اس نے اپنے نازک پروں کو حرکت میں لانے کی کوشش کی تو اُسے اپنے دائیں پَر میں شدید تکلیف محسوس ہوئی۔ اسی لمحے اسے یہ خیال آیا کہ وہ اس وقت بہت ٹھنڈی جگہ پر موجود ہے، جس کی وجہ سے اس کا جسم حرکت نہیں کر پا رہا، کیوں کہ وہ خوب صورت نازک پری سردی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

اس نے نظریں گھما کر اپنے اردگرد دیکھنے کی کوشش کی اور وہ یہ دیکھ کر بُری طرح سہم گئی کہ اس کا اندازہ بالکل درست ہے۔ وہ واقعی ایک

برفیلی جگہ پر موجود تھی، جہاں دور دُور تک صرف برف ہی برف نظر آ رہی تھی۔ یخ بستہ ہوائیں اور اُن کے آپس میں ٹکراؤ کا شور پرنیاں پری کو مزید خوف زدہ کرنے لگا۔ وہ ہر خوف کو دل میں دبا کر اپنی تمام تر ہمت جمع کر کے اٹھ کھڑی ہوئی، لیکن اٹھتے ہی اسے ایک آواز سنائی دی، اپنے زخمی پَر کے ٹوٹ جانے کی آواز۔

درد کی ایک تیز لہر اسے اپنے جسم میں محسوس ہوئی اور دھپ کی آواز کے ساتھ وہ دوبارہ اسی سفید زمین پر گر پڑی۔ ٹوٹے ہوئے پَر کی جان لیوا تکلیف پرنیاں کو اِس برف کی ٹھنڈی یخ زمین پر بے حس و حرکت پڑے رہنے پر آمادہ کر چکی تھی۔ پرنیاں کی بڑی بڑی خوب صورت روشن آنکھیں بھی اس کے گلابی ہونٹوں کی طرح جامنی رنگ میں تبدیل ہونے کے بعد بند ہونے لگیں اور تمام آوازیں بھی آہستہ آہستہ سنائی دینا بند ہو گئیں۔

.....☆.....

سورج کی کرنیں کھڑکی کے راستے پرنیاں کی آنکھوں پر پڑیں تو اُس نے کسمسا کر دھیرے دھیرے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا کہ وہ برفیلی ویران جگہ سے اس لکڑی سے بنے چھوٹے سے کمرے میں آرام دہ نرم اور گرم بستر پر کیسے پہنچی؟

وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں حیرت لیے اٹھنے کی کوشش کرنے لگی تو درد کی ٹیس اس کے بدن سے اٹھی اور وہ سسکی بھر کر رہ گئی۔ اتنے میں اس نے دیکھا کہ کسی نے اس کے ٹوٹے ہوئے دائیں پَر کی مرہم پٹی کر دی ہے۔

مگر کس نے؟

ابھی وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی، ساتھ ہی ایک پیاری سی بچی کمرے میں داخل ہوئی اور مسکرا کر کہنے لگی:

''صبح بخیر اچھی پری!''

پرنیاں اسے دیکھ کر گھبرا گئی اور پوچھا:

''کون ہو تم؟ اور میں یہاں کیسے پہنچی؟''

اس بچی نے پرنیاں پری کو بتایا کہ میرا نام ایمان ہے اور میں یہاں اپنے دادا جان کے ساتھ رہتی ہوں۔ کل شام ہماری بکری کھو گئی تھی، اس کی تلاش میں دادا جان اور میں بہت دور تک نکل گئے تھے۔ بکری تو نہیں ملی، لیکن میری نظر آپ پر پڑی تو میں نے دادا جان کو بتایا اور ہم آپ کو اُٹھا کر گھر لے آئے۔ آپ کے زخموں پر مرہم لگایا اور اَب آپ بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گی۔

پرنیاں پری یہ سب سن کر بہت خوش ہوئی اور دونوں کی دوستی ہو گئی۔ کچھ دنوں بعد جب پرنیاں پری بالکل ٹھیک ہو گئی تو اُس نے پریستان واپس جانے کی بات کی۔ ایمان یہ سن کر اُداس ہو گئی، لیکن پرنیاں پری نے ایمان سے وعدہ کیا کہ وہ اس سے ملنے آتی رہے گی تو اِیمان نے خوشی خوشی اسے جانے کی اجازت دے دی۔

پرنیاں پری اب بھی کبھی کبھار اپنی دوست اِیمان سے ملنے آتی ہے اور اُس کے لیے پریستان سے ڈھیر سارے تحفے لاتی ہے۔

اس دیس کا میں اک بچہ ہوں

نور محمد مکی حجازی۔ حاصل پور

اس دیس کا میں اک بچہ ہوں
بچپن کو گروی رکھا ہے
بابا بیمار سا رہتا ہے
پھر کتنی بار میں روتا ہوں
اس دیس کا میں اک بچہ ہوں
میں جب بازار کو جاتا ہوں
شیشے کی دنیا پاتا ہوں
پھر کتنی بار بکھرتا ہوں
اس دیس کا میں اک بچہ ہوں
میرے گھر کے سامنے کوٹھی ہے
وافر مقدار میں روٹی ہے
میں پھر بھی بھوکا سوتا ہوں
اس دیس کا میں اک بچہ ہوں
جب ساتھی مکتب جاتے ہیں
ماں باپ مجھے یاد آتے ہیں
پس اچھا ہوں ، یہ کہتا ہوں
اس دیس کا میں اک بچہ ہوں
سردی کی ٹھنڈی راتوں میں
کشکول ہے میرے ہاتھوں میں
مسجد کے سامنے بیٹھا ہوں
اس دیس کا میں اک بچہ ہوں
میں مکی سنبھل نہ پاؤں گا
میں آخر ٹوٹ ہی جاؤں گا
کیوں کہ میں دھاگا ابھی کچا ہوں
اس دیس کا میں اک بچہ ہوں

گزشتہ ماہ غلطی سے رہ جانے والا ایک صفحہ
جس پر ادارہ معذرت خواہ ہے۔

''ٹھیک ہے۔'' سب انسپکٹر کاشف بولے۔

''کاشف! ہم ایک بات تو بھول ہی گئے۔'' انسپکٹر غوری بولے۔

''وہ کیا سر!؟'' سب انسپکٹر کاشف نے کہا۔

''وہ یہ کہ ہم نے ریکارڈنگ میں دیکھا تھا کہ عاصم اپنے ہاتھ میں کچھ اٹھائے ہوئے تھا، مگر جب وہ کمرے سے باہر آیا تو اُس کے ہاتھ خالی تھے، گویا کہ اس نے وہ چیز کمرا نمبر 302 میں رکھی تھی۔'' انسپکٹر غوری بولے۔

''اوہ سر! اس طرف تو میرا دھیان ہی نہیں گیا۔''

''کاشف ایک کام کرو، میں مسٹر عاصم کے گھر سے تفتیش کر کے آتا ہوں۔ تم مسٹر عقیل سے پوچھ گچھ کرو کہ وہ، یعنی مسٹر عاصم کل رات دو بجے ان کے کمرے میں کیوں گئے؟'' انسپکٹر غوری بولے۔

''ٹھیک ہے سر!'' سب انسپکٹر کاشف بولے۔

.....(جاری ہے).....

پاکستان جاں بازوں کی سرزمین

ام محمد عبداللہ۔ جہانگیرہ

''نانا جان! یہ دیکھیں۔'' شہریار نے قالین پر ایک لمبی چھلانگ لگائی۔

''یہ بھی دیکھیں، اور یہ دیکھیں۔'' شہریار اپنے تئیں خوب جوش و خروش کے ساتھ چھلانگیں لگا لگا کر اپنے نانا جان کو متاثر کر رہا تھا۔

وہ عید کی چھٹیاں منانے کے لیے اپنے ننھیال آیا ہوا تھا اور بہت خوش تھا۔

''ارے بھئی واہ! بہت خوب!'' نانا جان، آٹھ سالہ نواسے کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے بولے۔ وہ بھی اپنے اس چھوٹے مہمان کی آمد سے خود میں تازگی محسوس کر رہے تھے۔

''آپ کو پتا ہے میں بڑا ہو کر کیا بنوں گا؟'' شہریار اَب نانا جان کے بازو کے ساتھ جھولنے لگا۔

''کیا؟'' نانا جان نے محبت سے اس کا گال چھوا۔

''میں بڑا ہو کر اِسپائڈر مین بنوں گا۔''

''ہائیں!'' نانا جان کو تو جیسے کرنٹ سا لگا۔

''بڑا ہو کر شہریار کیا بنے گا؟'' انھوں نے بے یقینی سے نواسے کی طرف دیکھا، جیسے تسلی کرنا چاہتے ہوں کہ وہ ابھی ابھی کیا کہہ رہا تھا۔

''نانا جان! اسپائڈر مین۔ یہ دیکھیں میری قمیص، سینڈل اور گھڑی۔'' انھوں نے دیکھا، سب پر اِسپائڈر مین کی مختلف تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ میرے شہریار کا ہیرو اِسپائڈر مین ہے۔ نانا جان گویا شدید صدمے کی حالت میں شہریار کو دیکھنے لگے۔

آئندہ چند دنوں تک وہ اسے جرات کی ایک داستاں سناتے رہے۔ محمد محمود عالم (ایم۔ ایم۔ عالم) ہماری ملی تاریخ کے ایک ناقابل فراموش اور زندہ و جاوید کردار ہیں۔ ان کا بچپن کتاب دوست بچپن تھا۔ نصابی، ہم نصابی اور کھیل کے میدان میں ہمیشہ نمایاں رہنے والا یہ بچہ فضا میں پرواز کرتے جہازوں کو بہت شوق سے دیکھا کرتا اور پورے یقین کے ساتھ کہتا: ''ایک دن میں بھی ہوا میں پرواز کروں گا۔'' ان کی ذہانت کے پیش نظر اُنھیں ڈاکٹر، انجینئر بن کر عیش و آرام کے ساتھ زندگی گزارنے کے مشورے ملتے، لیکن وہ مسکرا دیتے۔ عیش و آرام کے ساتھ زندگی گزارنا ان کا مقصد حیات نہ تھا۔ ان کا نصب العین تھا، ملک و قوم کا دفاع۔

۲، اکتوبر ۱۹۵۳ء کو اُنھیں پاک فضائیہ میں کمیشن ملا۔ انھوں نے یہاں کئی کام یاب کورس کیے۔ یہ ہوائیں، فضائیں ان کے سامنے مسخر تھیں۔ وہ کسی شاہین کی مانند بلند سے بلند تر پرواز کی طرف بڑھتے۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے یہ آفاق ان کی پرواز سے مسخر ہونے کو بے قرار ہیں۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

۶، ستمبر ۱۹۶۵ء کو بھارت کی بزدل فوج نے رات کے اندھیرے میں پاکستان پر اچانک حملہ کر دیا۔ بزدل اور عیار دشمن نہیں جانتا تھا کہ ہم نے اپنے دامن میں ایم۔ ایم۔ عالم جیسے گوہر نایاب سمیٹ رکھے ہیں۔

۷، ستمبر ۱۹۶۵ء کو بھارت کے دس ہنٹر طیارے سرگودھا کے ہوائی اڈے کو نشانہ بنانے کے لیے بھیجے گئے۔ سرگودھا کے ایئربیس پر پاک فضائیہ کی دفاع کے ذمے داری اسکواڈرن لیڈر ایم۔ ایم۔ عالم کے ذمے تھی۔ دشمن کے طیارے دیکھ کر اُن کے رگ و پے میں نئی طاقت بھر گئی۔ وہ پلٹ کر جھپٹنا اور جھپٹ کر پلٹنا کی مثال بن کر فضا میں اڑے۔ ان عظیم لمحوں کی داستان ان کے دوست امتیاز اَحمد بھٹی ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''۷ ستمبر کی صبح تین بجے پہلا حملہ ہوا اور دوسرا دوپہر کے بعد سرگودھا پر کیا گیا۔ ہمیں فوری طور پر تیاری کا حکم ملا۔ بھارتی فوج چھے چھے جہازوں

علم کا ذوق، عمل کا شوق بڑھانے والا بچوں کا رسالہ

ماہ نامہ

ذوق و شوق

کراچی

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہ العالی

کی زیر سرپرستی الحمدللہ گزشتہ ۱۵ برس سے مسلسل شائع ہو رہا ہے۔

اس شمارے میں بچوں/بچیوں کے لیے تعلیم، تربیت اور تفریح سے بھرپور مواد ہوتا ہے، جس کا بچوں/بچیوں کو انتظار رہتا ہے۔
یہ رسالہ بچوں کے ادب میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے اور ملک میں شائع ہونے والے بچوں کے رسالوں میں ایک امتیازی شان کا حامل ہے۔
اگر آپ اپنے بچوں/بچیوں کو فی زمانہ چھوٹی بڑی اسکرین سے بچانے کے لیے کسی متبادل کی تلاش میں ہیں تو ماہ نامہ ذوق وشوق کافی حد تک آپ کی امیدوں پر پورا کرسکتا ہے۔

اس کے لیے آپ اپنے نام، مکمل ڈاک کے پتے اور جس ماہ سے رسالہ جاری کروانا ہے اس ماہ کا نام لکھ کر صرف ہزار (=/1000) روپے جمع کروائیں اور ہر ماہ، ماہ نامہ ذوق وشوق گھر بیٹھے حاصل کریں۔ (شمارے کی قیمت بڑھنے کی صورت میں سالانہ خریداری کی رقم میں اضافہ ہوسکتا ہے۔)

سالانہ خریداری کے لیے تین طریقوں سے آپ رقم جمع کرواسکتے ہیں:

1 منی آرڈر کے ذریعے۔

اس کے لیے ہمارا پتا ہے: ماہ نامہ ذوق وشوق، کراچی، پی۔او۔بکس نمبر: 17984، گلشن اقبال، کراچی۔ پوسٹ کوڈ: 75300

2 بینک اکاؤنٹ کے ذریعے۔

بینک اکاؤنٹ میں رقم جمع کروانے کے لیے ہمارا بینک اکاؤنٹ ہے:

اکاؤنٹ ٹائٹل: Bait ul ilm Trust Zouq o Shouq

اکاؤنٹ نمبر: 0179-0103431456

(نوٹ: بینک اکاؤنٹ میں رقم جمع کروانے کی رسید آپ ہمیں اس نمبر پر (0324-2028753) واٹس ایپ کردیں۔)

3 دستی، یعنی دفتر آکر۔

دفتر میں آکر رقم جمع کروانے کے لیے ہمارا پتا ہے: مدرسہ بیت العلم، ST-9E، نزد الحمد مسجد، گلشن اقبال بلاک 8، کراچی

(نوٹ: دستی رقم جمع کرواتے وقت سالانہ خریداری فارم ضرور پُر کریں۔)

کوپن برائے
بلاعنوان ۱۷۰

نام: ______ ولدیت: ______

مکمل پتا: ______

فون نمبر: ______

کوپن برائے
ذوقِ معلومات ۶۹

نام: ______ ولدیت: ______

مکمل پتا: ______

فون نمبر: ______

سوال آدھا جواب آدھا ۲۵

نام: ______ ولدیت: ______

مکمل پتا: ______

فون نمبر: ______

کوپن برائے
قرآن کوئز ۱۴

نام: ______ ولدیت: ______

مکمل پتا: ______

فون نمبر: ______

مقابلۂ خوش خطی ۱۴

نام: ______ ولدیت: ______

مکمل پتا: ______

فون نمبر: ______

ہدایات: جوابات ۳۱، اکتوبر ۲۰۲۱ء تک ہمیں موصول ہو جانے چاہییں ...... ☆ ایک کوپن ایک ہی ساتھی کی طرف سے قبول کیا جائے گا......
☆ کمیٹی کا فیصلہ حتمی ہوگا جس پر اعتراض قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ مقررہ تاریخ کے بعد موصول ہونے والے جوابات قرعہ اندازی میں شامل نہیں کیے جائیں گے۔

پیارے پیارے بچوں کے لیے بیت العلم کی نئی کتابیں

والدین و سرپرست حضرات سے گزارش

بچوں کو کہانیاں سننا اچھا لگتا ہے.... کہانیاں سننے سے ان کی صلاحیتیں بڑھتی ہیں.... بچوں کی کتابوں سے دوستی ہو جاتی ہے اور آداب سیکھنے کا موقع ملتا ہے۔

والدین اپنے بچوں کو کتاب دوست بنانے کے لیے یہ کتابیں ضرور پڑھ کر سنائیں، کتاب پڑھنے اور سمجھنے میں بچوں کی مدد بھی کریں۔

اب Playstore سے ڈاؤن لوڈ کریں۔

GET IT ON Google Play

maktababaitulilm

بیت العلم

Karachi Ph : 021-32726509
Lahore Ph : 042-37112356
www.mbi.com.pk

سلسلۂ

تحفۃ الدعاء

دعا عظیم نعمت اور انمول تحفہ ہے، دعا اللہ تعالیٰ کے قرب اور اس سے راز و نیاز کا ذریعہ ہے، دعا مایوسی میں امید کی کرن ہے، دعا کے ذریعے ہم اللہ تعالیٰ سے اپنے تمام مسائل حل کروا سکتے ہیں، اس دنیا میں کوئی بھی انسان کسی بھی حال میں دعا سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔

اسی فکر کے پیشِ نظر "مکتبہ بیت العلم" نے تحفۃ الدعا سیریز کے نام سے ایک سلسلہ شروع کیا ہے۔
اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ! اس سیریز کے چھ حصے شائع ہو چکے ہیں۔

MaktabaBaitulilm

بیت العلم

Karachi Ph : 021-32726509
Lahore Ph : 042-37112356
www.mbi.com.pk